ناگ پری

ناگ پری

ترُکی کہانیاں

فرخندہ لودھی

فہرست

مُنّی چلی بازار

کِسی شہر میں ایک چھوٹی سی لڑکی رہتی تھی۔ ایک دن اس کی امّی نے کہا:

''مُنّی یہ لو پیسے۔ جلدی جاؤ اور قصّاب کی دُکان سے گوشت خرید لاؤ۔ رات کے لیے ہنڈیا پکانی ہے۔ اور دیکھو مُنّی ، راستے میں تالاب ہے نا؟ اُس میں گوشت کو دھو کر لانا، تاکہ فوراً ہی چولھے پر چڑھا دوں۔''

مُنّی نے ویسے ہی کیا جیسے امّی نے کہا تھا۔ گوشت خریدا اور گھر واپس آتے ہوئے تالاب پر دھونے بیٹھ گئی۔ جب پانی پر جھُکی تو ایک سارس اُڑتا ہوا آیا اور مُنّی کے ہاتھ سے گوشت جھپٹ کر یہ جا وہ جا۔ مُنّی بے چاری دیکھتی رہ گئی۔

مُنّی زور زور سے چلّا چلّا کر کہنے لگی ''واپس آ جاؤ! واپس آ جاؤ! خُدا کے لیے میرا گوشت واپس کر دو۔ خالی ہاتھ گھر گئی تو امّی مجھے ماریں گی۔''

سارس نے دُور سے جواب دیا۔ ''تمھیں گوشت واپس مل سکتا ہے، مگر ایک شرط ہے۔ اس کے بدلے میں جَو کی ایک بالی لا دو۔''

مُنّی بے چاری بھاگم بھاگ کھیت میں گئی تاکہ جَو کی بالی توڑ لائے۔ مگر وہاں ایک بھی بالی نہ تھی۔ صرف پودوں کے ڈنٹھل پڑے ہوئے تھے۔ مُنّی نے کہا:

''ڈنٹھل اے ڈنٹھل خُدا کے لیے مجھے جَو کی ایک بالی دے دے۔ بالی میں سارس کو دوں گی۔ سارس مجھے گوشت واپس کر دے گا۔ گوشت لے کر میں گھر جاؤں گی، نہیں تو امّی ماریں گی۔''

ڈنٹھل نے جواب دیا۔ ''میرے پاس جَو کی ایک بالی بھی نہیں۔ اس سال بارش تو ہوئی نہیں، کھیت کیسے اُگتا۔ اگر تُم اللہ میاں سے بارش کی دُعا کرو تو میں تمھیں جَو کی بالی دے دوں گا۔''

لڑکی نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے اور دُعا مانگی۔ اللہ میاں، بارش برسا دو۔ بارش سے کھیت میں فصل اُگے گی اور ڈنٹھل مجھے جَو کی بالی دے دے گا۔ بالی میں سارس کو دوں گی۔ سارس مُجھے گوشت واپس کر دے گا۔ گوشت لے کر میں گھر

جاؤں گی، نہیں تو امی ماریں گی۔"

جب وہ دُعا مانگ چکی تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی دُور کھڑا، اُسے دیکھ رہا ہے۔ آدمی بولا:

"ننھی، تمھیں معلوم ہے دُعا کو اللہ میاں تک پہنچانے کے لیے لوبان کی دھونی دی جاتی ہے۔ خُوشبودار دھوئیں کے ساتھ دُعا سیدھی آسمان کی طرف جاتی ہے اور اللہ میاں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ بھاگی بھاگی جاؤ اور بازار سے لوبان لے آؤ۔"

مُنّی بے چاری بھاگی بھاگی بازار گئی اور دُکان دار سے کہا۔ "دکان والے، دکان والے۔ تیرے پڑیں نہ دِل پر تالے۔ خُدا کے لیے مُجھے تھوڑا سا لوبان دے دے۔ میں لوبان لگا کر اللہ میاں سے بارش کے لیے دُعا مانگوں گی۔ مینہ برسے گا تو جَو کا کھیت اُگے گا۔ کھیت ہرا ہو گا تو مجھے جَو کی بالی ملے گی۔ بالی میں سارس کو دوں گی۔ سارس مجھے گوشت واپس کر دے گا۔ گوشت لے کر میں گھر جاؤں گی، نہیں تو امّی ماریں گی۔"

دُکان دار نے جواب دیا۔ "ننّھی، میں تمھیں لوبان ابھی دیتا ہوں۔ لیکن پہلے

میرا ایک کام کرو۔ ذرا موچی کے ہاں جاؤ۔ میرے لیے جوتا لے آؤ۔"

مُنّی غریب دوڑی دوڑی موچی کے پاس گئی اور کہا۔ "موچی رے موچی۔ تیری پکتی ہے روٹی۔ مجھے دکان دار کے لیے جوتے دے دو۔ جوتے پہن کر وہ مجھے لوبان دے گا۔ لوبان لگا کر میں اللہ میاں سے دُعا مانگوں گی۔ اللہ میاں مینہ برسائے گا۔ مینہ سے جَو کا کھیت ہرا ہو گا۔ ڈنٹھل مجھے جَو کی بالی دے گا۔ بالی میں سارس کو دُوں گی۔ سارس مجھے گوشت واپس دے گا۔ گوشت لے کر میں گھر جاؤں گی، نہیں تو امّی ماریں گی۔"

موچی نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، مُنّی۔ میں تمھیں دُکان دار کے لیے جوتے بنا دوں گا۔ لیکن پہلے تم میرا ایک کام کرو۔ بھاگی بھاگی جاؤ اور چمار سے تھوڑا سا چمڑا لے آؤ۔"

مُنّی غریب چمار کے پاس پہنچی اور کہا: "چمار رے چمار۔ تو کبھی نہ مانے ہار۔ مُجھے تھوڑا سا چمڑا دے۔ چمڑا میں موچی کو دوں گی۔ موچی دکان دار کے لیے جوتے بنائے گا۔ دکان دار مجھے لوبان دے گا۔ لوبان لگا کر میں اللہ سے دُعا مانگوں

گی۔ اللہ میاں مینہ برسائے گا۔ مینہ سے کھیت ہرا ہو گا۔ ڈنٹھل مُجھے بالی دے گا۔ بالی میں سارس کو دوں گی۔ سارس مجھے گوشت واپس کر دے گا۔ گوشت لے کر میں گھر جاؤں گی، نہیں تو امّی ماریں گی۔"

چمار نے جواب دیا۔ "مُنّی، پہلے تم میرا ایک کام کرو۔ ذرا بیل کے پاس جاؤ اور اُس سے تھوڑی سی کھال مانگ لاؤ۔ کھال سے میں چمڑا تیّار کر دوں گا۔"

وہاں سے مُنّی ایک کھیت میں گئی جہاں بیل ہل چلا رہا تھا۔ جاتے ہی بولی:

"بیل بھیّا، بیل۔ تیرا اُترے دِل کا میل۔ مُجھے تھوڑی سی کھال دے۔ کھال میں چمار کو دُوں گی۔ چمار مجھے چمڑا دے گا۔ چمڑا میں موچی کو دوں گی۔ موچی جوتا بنائے گا۔ جوتا میں دُکان دار کو دوں گی۔ دکان دار مجھے لوبان دے گا۔ لوبان لگا کر اللہ میاں سے دُعا مانگوں گی۔ اللہ مینہ برسائے گا۔ مینہ سے کھیت ہرا ہو گا۔ ڈنٹھل مجھے جَو کی بالی دے گا۔ بالی سارس کو دوں گی تو سارس میرا گوشت واپس کر دے گا۔ گوشت لے کر میں گھر جاؤں گی، نہیں تو امّی ماریں گی۔"

بیل نے جواب دیا۔ "ہاں مُنّی، تم کھال ضُرور لے لینا، لیکن پہلے میرا ایک کام

کرو۔ ذرا جلدی سے جاؤ اور میرے لیے چارے کا ایک گٹھا لے آؤ۔"

مُنّی غریب پھر بھاگی اور کسان کے پاس پہنچی۔ کسان کھیت میں کام کر رہا تھا۔ اس نے کسان سے کہا:

کسان رے کسان، میں تیرے قربان۔ مجھے چارے کا ایک گٹھا دے دے۔ گٹھا میں بیل کو دوں گی۔ بیل مجھے کھال دے گا۔ کھال چمار کو دوں گی۔ چمار مجھے چمڑا دے گا۔ چمڑا مُوچی کو دوں گی۔ مُوچی مجھے جوتا دے گا۔ جوتا دُکان دار کو دوں گی۔ دُکان دار مجھے لوبان دے گا۔ لوبان لگا کر دُعا مانگوں گی۔ اللہ مینہ برسائے گا۔ مینہ سے کھیت ہرا ہو گا۔ ڈنٹھل مجھے جَو کی بالی دے گا۔ بالی میں سارس کو دوں گی۔ سارس میرا گوشت واپس کر دے گا۔ گوشت لے کر میں گھر جاؤں گی، نہیں تو امّی ماریں گی۔"

کسان نے جواب دیا۔ "مُنّی، میں تمہیں چارے کا گھٹا ضرور دوں گا۔ لیکن پہلے مجھے۔۔۔۔۔"

مُنّی جلدی سے بولی۔ "پہلے کیا؟"

”پہلے مجھے پیار کرو۔“کسان نے کہا۔

مُنّی نے جلدی سے کسان کے گال کو چوم لیا۔ کسان نے مُنّی کو چارے کا گٹھا دیا۔ مُنّی نے وہ گٹھا بیل کو دیا۔ بیل نے تھوڑی سی کھال دی۔ مُنّی نے وہ کھال چمار کو دی۔ چمار نے اُسے چمڑا دیا۔ چمڑا مُنّی نے مُوچی کو دیا۔ موچی نے دکان دار کے لیے جوتے بنائے۔ جوتے لے کر مُنّی دکان دار کے پاس گئی۔ دکان دار نے اُسے لوبان دی۔ مُنّی نے لوبان سُلگایا۔ جب دُھواں آسمان کی طرف جانے لگا تو ہاتھ اُٹھائے اور اللہ میاں سے بارش کی دُعا مانگی۔ اللہ میاں نے بارش برسا دی۔ کھیت اُگا۔ ڈنٹھل نے مُنّی کو جَو کی بالی دی۔ مُنّی بالی لے کر سارس کے پاس گئی۔ سارس نے اُسے گوشت واپس کر دیا۔ مُنّی گوشت لے کر گھر گئی۔ امّی نے ہنڈیا پکائی۔ دونوں نے کھانا کھایا۔

چھوٹا بھائی

تُرکی کے کسی گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑے کا نام سُلیمان تھا اور چھوٹے کا محمود۔ محمُود بے چارہ کچھ کم عقل تھا۔ باپ مرا تو دونوں بھائیوں کو جائداد میں جانوروں کا ایک ریوڑ بھی ملا۔ کچھ عرصے دونوں مِل کر ریوڑ چراتے رہے۔ ایک دن محمُود کو خیال آیا کہ اگر ہم دونوں، جانور آپس میں بانٹ لیں تو بڑا فائدہ ہو۔

انہیں باپ کی جو زمین مِلی تھی اس میں جانوروں کے دو باڑے تھے۔ ان میں سے ایک باڑا تو نیا اور مضبوط تھا لیکن دوسرا اتنا پرانا اور کم زور کہ ہاتھ لگاتے ہی نیچے آ رہے۔ محمُود نے سُلیمان سے کہا کہ جو جانور خُود بخود نئے باڑے میں چلا جائے وہ میرا، اور جو پرانے باڑے میں جائے وہ تمہارا۔ بڑے بھائی سُلیمان نے کہا بُہت اچھا۔ ”مجھے تمہاری تجویز پسند ہے۔ لیکن یُوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ جو جانور خود بخود نئے باڑے میں جائیں وہ میرے اور جو پُرانے باڑے میں جائیں وہ

تمہارے۔"

"چلو، یوں ہی سہی۔" محمُود مان گیا۔

اُسی دن دونوں بھائی کھیت میں گئے اور سارے جانور ہانک کر وہاں لے آئے جہاں باڑے تھے۔ ساری بھیڑ بکریاں اور گائے بیل اپنے آپ نئے باڑے میں چلے گئے صرف ایک مریل، اندھا بیل، جسے راستہ نظر نہ آتا تھا، لڑھکتا ہُوا پرانے باڑے میں چلا گیا۔ محمُود نے کچھ نہ کہانہ سُنا، مزے سے اپنا اندھا بیل پکڑ کر کھیت میں چَرانے لے گیا۔ وہ ہر روز اُس مَریل بیل کو چَرانے لے جاتا اور شام ڈھلے ہانک کر پرانے باڑے میں بند کر دیتا۔

ایک روز وہ اپنے اندھے بیل کو چَرانے لے جا رہا تھا کہ زور کی آندھی چلنے لگی۔ آندھی کے زور سے ایک بُہت پرانا درخت ڈولنے اور چرچرانے لگا۔

"خبردار! بوڑھے کتّے! بھونکو مت۔" محمُود نے درخت کو ڈانٹا۔ لیکن آندھی چلتی رہی اور درخت اسی طرح جھُومتا اور چرچراتا رہا۔ اُسے محمُود کے ڈانٹنے کی ذرا پروا نہ تھی۔

"میں کہتا ہوں، خاموش!" محمُود نے اور زیادہ غصّہ دکھایا۔ لیکن درخت ہوا کے زور سے چرچراتا رہا۔ محمُود نے کُلہاڑی اُٹھائی اور درخت کے تنے پر زور سے ماری۔

"لو! اب بولو!" اس نے درخت سے کہا۔

ارے واہ! اُس نے تنے پر جہاں کُلہاڑی ماری تھی، وہاں سے اشرفیوں کا پرنالا پھُوٹ پڑا تھا۔

یہ دیکھ کر محمُود بھاگا بھاگا بڑے بھائی کے پاس گیا اور کہا "تھوڑی دیر کے لیے ایک بیل دے دو۔ میں آج دو بَیلوں سے ہل جوتوں گا۔" ساتھ ہی اُس نے ایک گاڑی اور چند خالی بوریاں بھی مانگیں۔ پھر ساری چیزیں لے کر وہ جلدی سے درخت کے پاس پہنچا۔ جب شام ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا تو وہ دولت لے کر گھر آ گیا۔

سُلیمان نے دولت کا اتنا بڑا انبار دیکھا تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے محمُود سے کہا: "چھوٹے بھائی، اچھا ہو کہ ہم یہ دولت آپس میں آدھی آدھی

تقسیم کرلیں۔"

احمق محمُود فوراً راضی ہو گیا اور جا کر ہمسائے سے ترازو مانگنے چلا گیا۔ ہمسائے کے پاس ترازو تو تھی اور وہ اسے دے بھی سکتا تھا مگر اُس کو فکر ہوئی کہ محمُود کیا تولنا چاہتا ہے جو یوں ہانپتا ہوا آیا ہے۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اُس نے ترازو کے پلڑوں کے نیچے تھوڑا تھوڑا تارکول لگا دیا۔

ہمسائے کا شُبہ درست نکلا۔ ایک گھنٹے بعد محمُود نے ترازو واپس کی تو پلڑے کے نیچے ایک اشرفی چپکی ہوئی تھی۔ اب کیا تھا۔ رات ہوتے ہوتے پورے گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ محمُود اور سلیمان کو کہیں سے خزانہ ملا ہے۔

سُلیمان کو فکر ہوئی۔ اس نے محمُود کو سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھو چھوٹے بھائی، ساری دنیا کو پتا چل گیا ہے کہ ہم بہت امیر ہو گئے ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے خزانے کو کسی محفوظ جگہ گاڑ دیا جائے اور ہم دونوں کچھ عرصے کے لیے کہیں چلے جائیں۔" سُلیمان نے یہ کہا اور بیلچہ اُٹھایا، گھر کے پچھواڑے گہرا گڑھا کھودا اور اس میں خزانہ دفن کر کے چل پڑا۔ چھوٹا بھائی محمُود اُس کے پیچھے پیچھے یوں

لُڑھک رہا تھا جیسے نیند میں ہو۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ سُلیمان چلتے چلتے رُک گیا اور بولا:

"چھوٹے بھائی، جلدی میں مَیں گھر کا دروازہ بند کرنا بھول گیا ہوں۔ بھاگ کے جاؤ اور بند کر آؤ۔"

محمُود دروازہ بند کرنے چلا گیا۔ بڑا بھائی آرام سے سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد محمُود آتا دکھائی دیا۔ وہ ہچکولے کھاتا ہوا مُشکل سے چل رہا تھا۔ کندھے پر دروازے کے پٹ چوکھٹ سمیت رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے سُلیمان سے کہا:

"بڑے بھائی، میں دروازہ ہی اُکھیڑ لایا ہوں۔ نہ دروازہ ہو گا اور نہ کوئی کھولے گا۔"

سُلیمان کو بھائی کی اس حماقت پر سخت غصّہ آیا۔ اُس نے سوچا اس احمق کے ساتھ رہنا تو سراسر گھاٹا ہے۔ کسی طریقے سے اس سے چھُٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ وہ

بھائی سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچ ہی رہا تھا کہ تین گھُڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ اس نے سوچا کہ یہ تینوں دولت کی خبر سُن کر اُن کے لُوٹنے کے لیے آئے ہیں۔ اس نے محمود کو اشارہ کیا اور دونوں بھاگ کر نزدیک کے ایک درخت پر چڑھ گئے۔ محمُود نے دروازہ بھی اُوپر گھسیٹ لیا۔

وہ درخت پر چڑھے ہی تھے کہ گھُڑ سوار عین اُسی درخت کے نیچے آ کر رُک گئے اور گھوڑوں سے اُتر کر درخت کے نیچے رات بسر کرنے کا انتظام کرنے لگے۔ رات کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ چُپ سادھے بیٹھے رہے تو جان بچ جائے گی۔

مگر محمُود اتنا بے وقوف تھا کہ نِچلا بیٹھ ہی نہ سکتا تھا۔ اُس نے دروازے کو سبھالنے کی بُہت کوشش کی مگر افسوس دروازہ ٹھا کی آواز کے ساتھ نیچے سوئے ہوئے گھُڑ سواروں پر جا گِرا۔ وہ خوف زدہ ہو کر اُٹھ بیٹھے۔ اُنہیں حیرت تھی کہ یہ دروازہ کہاں سے ٹپک پڑا، کچھ دیر تو ڈر کے مارے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے اور پھر فوراً ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔

سُلیمان نے اب پکّا ارادہ کر لیا کہ جیسے بھی ہو، اپنے چھوٹے بھائی کا ساتھ چھوڑ دے۔ اس کے ساتھ گزارہ مشکل ہے۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھائی کو وہیں چھوڑ کر اکیلا چلا جائے گا۔ چُناں چہ جب سُورج طلوع ہوا تو وہ درخت سے اُترا اور ایک طرف کو ہو لیا۔

محمُود ابھی تک اُونگھ رہا تھا۔ جب دِن کا اُجالا اچھی طرح پھیل گیا تو اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سُلیمان غائب تھا۔ وہ درخت سے کُود کر نیچے آیا اور مزے سے سیٹی بجانا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ دوپہر ہونے تک وہ ایک گاؤں میں پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اُسے خیال آیا کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے، اس لیے کچھ کھا لینا چاہیے۔ مگر جیب میں تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ کیا خریدتا اور کیا کھاتا؟ وہ گاؤں میں گھومنے پھرنے لگا۔ نماز کا وقت تھا اور لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جا رہے تھے۔

محمُود ایک طرف کھڑا ہو گیا اور ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگنے لگا۔ رحم دل لوگ اُس کی ہتھیلی پر پیسہ دو پیسہ رکھ جاتے۔ اتنے میں ایک موٹا آدمی وہاں آیا اور اُس سے

پوچھنے لگا:

"تم میرے ہاں نوکری کرو گے؟" اِن دِنوں نوکروں کی سخت کمی تھی۔ کام کرنے والا آدمی بڑی مُشکل سے ہاتھ آتا تھا۔

"ہاں جناب، بڑی خوشی سے۔ لیکن ایک شرط ہے۔" محمُود نے موٹے سے کہا۔

"کہو، کہو۔" موٹے نے بے صبری سے پوچھا۔

محمُود نے جواب دیا۔ "جناب، میں جو کچھ بھی کروں، آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔ اِسی طرح میں بھی آپ سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ لیکن یاد رہے، اگر آپ نے یہ شرط توڑ دی تو میں آپ کی گردن توڑ دوں گا۔ اور اگر شرط میں توڑوں تو آپ میری گردن توڑ دیں۔"

یہ شرط تھی تو بڑی عجیب، مگر موٹا رضامند ہو گیا اور اُسے اپنے گھر لے گیا۔

محمُود نے گھر پہنچ کر سوچا کہ وہ موٹے کو تنگ کرے اور وہ ناراض ہو کر اُس کو جان سے مار دے۔ سو اُس نے جاتے ہی موٹے کی مرغیوں کے پیچھے دوڑنا شروع

کر دیا۔ جب ساری مرغیاں پورے گاؤں میں بِکھر گئیں تو وہ بھاگا بھاگا موٹے کے پاس آیا اور پوچھا :

"جناب، آپ ناراض تو نہیں ؟"

"ناراض ؟" موٹے نے حیرت سے کہا۔ "بالکل نہیں۔" لیکن وہ آیندہ اِس احمق کو کِسی شرارت کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اب محمُود سارا دِن موٹے آدمی کے گھر بے کار بیٹھا رہتا۔ کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتا۔ نہ موٹا اُسے کچھ کرنے کے لیے کہتا۔

یہ بات موٹے آدمی کی بیوی کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بیوی ایک موٹے تازے نوکر کو بے کار بٹھا کر کھلائے اور مُنہ سے کچھ نہ کہے۔ محمُود بے حد پیٹو اور نکمّا تھا۔ اس سے جب بھی کوئی کام کرنے کو کہا جاتا وہ برتن توڑنے اور چیزیں اُٹھا اُٹھا کر پھینکنے لگتا۔ اُسے مُنّے کو کِھلانے کا بڑا شوق تھا مگر وہ اُس کو کِسی نہ کِسی بہانے چھیڑ دیتا یا گِرا دیتا تا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ موٹا اُس کو نکالتا تو وہ نکلتا نہ تھا۔ عجب بلا بن کر بیٹھا تھا۔ آخر تنگ آ کر ایک رات بیوی نے

خاوند کو سمجھایا کہ خود ہی کہیں نِکل چلو، ورنہ جینا دوبھر ہو جائے گا۔ انہوں نے اُسی رات سامان باندھا، محمُود کو سوتا چھوڑا اور گھر سے نِکل کھڑے ہوئے۔

لیکن محمُود سویا ہوا نہیں تھا۔ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس نے میاں بیوی کی ایک ایک بات سُن لی تھی۔ وہ چُپکے سے اُٹھا اور جب میاں بیوی سامان باندھ رہے تھے تو وہ بھی ایک گٹھڑی میں بندھ گیا۔

چلتے چلتے، صُبح کو، وہ اگلے گاؤں میں پُہنچے۔ دونوں میاں بیوی اس خیال سے بڑے خُوش تھے کہ گاؤں چھوڑنا پڑا، کم بخت نوکر سے تو جان چھوٹی۔ مگر وہ مُصیبت کہاں ٹلی تھی۔ وہ تو گٹھڑی میں موجود تھی۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا تو دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

آخر سوچتے سوچتے انہیں ایک ترکیب سُوجھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگلی رات وہ دریا کے کنارے ڈیرا ڈالیں گے۔ اُنہوں نے دریا پر پُہنچ کر محمود کا بستر ایسی جگہ بچھایا کہ سوتے میں وہ ایک ہی کروٹ لے تو دھڑام سے دریا میں جا گرے۔ مگر محمُود نے کہا کہ وہ پانی کے قریب نہیں سوئے گا۔ اب آپس میں بحث ہونے لگی۔

موٹے آدمی کی بیوی محمُود کو بستر کے پاس لے گئی اور پانی کے قریب سونے کے فائدے بتانے لگی۔ اس کو تُوتُو مَیں مَیں میں اُس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ سر کے بل پانی میں جاگری۔

"جناب، آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟" محمُود نے موٹے سے پوچھا۔ "ناراض کے بچّے!" موٹا غصّے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ "تم ناراض ہونے کا پوچھتے ہو۔ تمہاری وجہ سے میں نے اپنا گاؤں چھوڑا، بیوی موت کے مُنہ میں چلی گئی اور پوچھتے ہو ناراض تو نہیں ہوں؟ میں پوچھتا ہوں تم جیسے احمق پر کسے غصّہ نہیں آئے گا۔"

"اپنا وعدہ یاد کیجیے، جناب۔" محمُود نے یہ کہا اور موٹے کو بھی پانی میں دھکیل دیا۔ اس کے بعد اس نے ہاتھ جھاڑ کر جیبوں میں ڈالے اور کندھے جھٹک کر مزے سے سیٹی بجاتا واپس چل دیا۔

سڑکوں پر گھومتے ہوئے اُس کو ایک روپیہ ملا۔ اُس نے فوراً اُٹھالیا۔ جب وہ آوارہ گردی کرتا ہوا ایک گاؤں میں پہنچا تو اُسے سخت بھُوک لگ رہی تھی۔ اُس نے

بھُنے ہوئے چنے خرید لیے اور مزے سے چنے چباتا ہوا اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

چلتے چلتے راستے میں ایک چھوٹی سی پیاری سی ندی آئی جس پر لکڑی کا چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا۔ محمُود نے سوچا، یہاں کچھ دیر آرام کرنا چاہیے۔ جب وہ پُل کے جنگلے پر جھُکا ہوا بہتے پانی کو دیکھ رہا تھا تو چنوں کا لفافہ پانی میں جا گرا۔ پانی کی تیز لہریں لفافے کو بہا لے گئیں۔ محمُود کی خوشی غم میں بدل گئی اور وہ زور زور سے چلّانے لگا:

”ارے! ارے او، پانی کے بچّے! میرے چنے لیے جاتا ہے۔ واپس لے کر آ۔ واپس لے کر آ۔ نہیں تو مُکّے مار مار کر بھُرکس نکال دوں گا۔“

غصّے نے اُسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ کافی دیر وہیں کھڑا پانی کو گالیاں دیتا اور مُکّے دکھاتا رہا۔

اچانک ندی میں سے ایک دیو کا سر اُبھرا اور اُس نے غصّے سے گرج کر کہا:

”یہ ندی میری ہے۔ تُم مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو؟ تمہیں کیا چاہیے؟“

”مجھے میرے چنے دے دو۔“ محمُود نے کہا۔ ”تمہاری ندی میرے چنے لے گئی ہے۔ اب میں کیا کھاؤں گا؟“
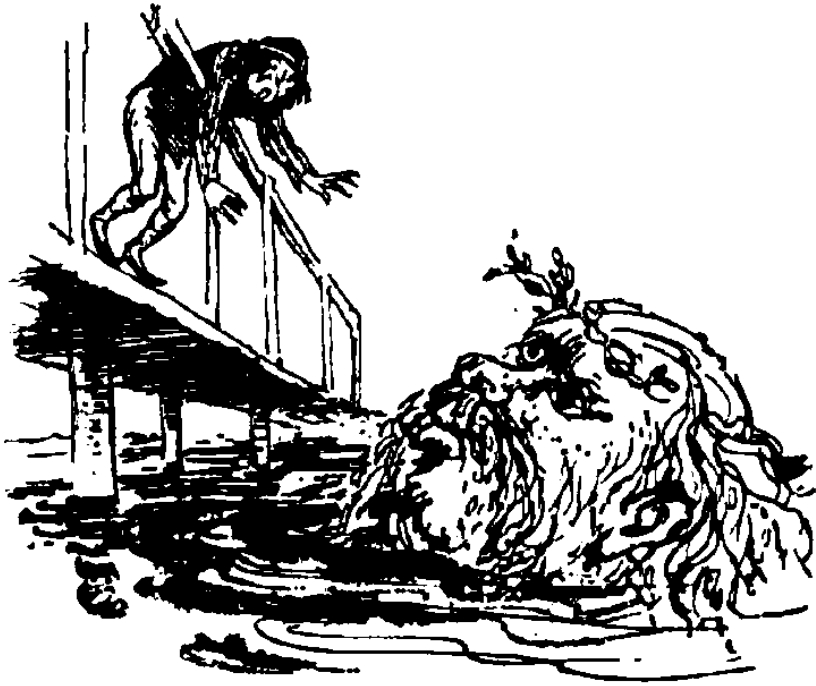
دیو نے کہا۔ ”میں تمہیں چنوں سے کہیں اچھی چیز دینے کو تیّار ہوں، مگر خُدا کے لیے شور مت مچاؤ۔“

اس نے یہ کہا اور پانی میں ڈبکی لگائی۔ چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ دیو ایک چھوٹی

سی میز اُٹھائے پانی کی سطح پر اُبھرا اور محمُود سے بولا:

"دیکھو میاں!" محمُود دیکھنے کے لیے آگے جھُکا تو دیو نے بتایا۔ "یہ چھوٹی سی میز ہے۔ تمھیں جب بھُوک لگے تو اس کو سامنے رکھ کے کہنا۔ میز صاحبہ، مجھے بھُوک لگی ہے۔ اسی وقت طرح طرح کے لذیذ کھانے حاضر ہو جائیں گے۔ کھا چکو تو کہنا میز صاحبہ، میرا پیٹ بھر گیا۔ شکریہ۔"

دیو نے میز محمُود کے حوالے کی اور خود پانی میں ڈُبکی لگا کر غائب ہو گیا۔ محمُود نے سوچا کیوں نہ کھانا کھایا جائے۔ فوراً میز سامنے رکھی اور کہا:

"میز صاحبہ، مجھے بھُوک لگی ہے۔"

پلک جھپکتے میں اس کے سامنے قسم قسم کے لذیذ کھانے آ گئے۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کھانے کو پہلے کھائے اور کِس کو بعد میں؟ بس اُس نے خُوب کھایا۔ خُوب کھایا۔ جب پیٹ کا کوئی کونا خالی نہ رہا تو کہا:

"میز صاحبہ، میرا پیٹ بھر گیا۔۔۔ شکریہ۔"

ابھی اُس کا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ میز صاف ہو گئی. اُس نے میز اُٹھا کر کندھے پر رکھی اور آگے چل پڑا۔

وہ مزے مزے سیٹی بجاتا اُگلے گاؤں میں پُہنچا تو سوچا کہ کیوں نہ گاؤں والوں کی شان دار دعوت کی جائے۔ وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور چیخ چیخ کو کہنے لگا:

"آج شام کو، گاؤں کے چوک میں سب لوگوں کی دعوت ہے۔ آنا نہ بھولیے۔"

شام کو گاؤں کے چوک میں بھیڑ لگ گئی۔ لوگ حیرت کے مارے ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے۔ اس احمق اجنبی پر اُنہیں ہنسی بھی آ رہی تھی جو بغیر کسی وجہ کے اتنے لوگوں کو کھانے کی دعوت دے رہا تھا۔ کھانے کا کوئی بندوبست بھی نظر نہ آتا تھا۔ دیگیں اور دیگچے تو کیا، آگ کی ایک چنگاری بھی نہ تھی جس پر کھانا تیار کیا گیا ہو۔ لوگوں نے ایک دوسرے کے کان میں کہا:

"یہ ہمیں اُلّو بنا رہا ہے۔ آؤ، اس کے دو چار چپت لگائیں اور اس مذاق کا مزا چکھائیں۔"

لوگ آپس میں بحث کرنے اور جھگڑنے لگے، لیکن محمُود اِطمینان سے میز سامنے رکھے بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے میز سے کہا:

"میز صاحبہ، مجھے بھُوک لگی ہے۔"

اگلے ہی لمحے میز پر کئی قسم کے کھانے آ گئے۔ ایسے کھانے دیہاتیوں نے کبھی دیکھے تک نہ تھے۔ وہ بسم اللہ کہہ کر کھانے پر پل پڑے۔ کھاتے کھاتے اُن کا بُرا حال ہو گیا۔ جب اُن کے پیٹ خُوب بھر گئے تو محمُود نے پوچھا:

"سب نے پیٹ بھر کے کھا لیا؟" لوگوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا "ہاں، ہاں۔ ہم نے اس سے پہلے اتنا اچھا کھانا کبھی نہیں کھایا۔ شکریہ۔"

یہ سُن کر محمُود نے میز سے کہا۔ "میز صاحبہ، میرا پیٹ بھر گیا۔ شکریہ۔"

دیکھتے ہی دیکھتے میز پر سے سارے برتن غائب ہو گئے۔ محمُود نے میز کندھے پر رکھی اور ایک درخت کے نیچے آرام کرنے چلا گیا۔

حیرت کے مارے دیہاتیوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک آدمی نے کہا۔

”کاش! ہم روز اسی طرح کھا پی سکیں۔“

”کیوں نہیں کھا سکتے۔“ دوسرے نے جواب دیا۔ ”بس اس میز کی ضرورت ہے۔ یہ اجنبی تو بالکل احمق ہے۔“

پھر وہ سر جوڑ کر بیٹھے اور فیصلہ کیا کہ جب یہ شخص سو جائے تو میز چُرا لی جائے۔

دوسرے دِن صُبح سویرے ہی، جب مُرغ اذانیں دے رہے تھے، محمُود کی آنکھ کھُل گئی۔ میز کو دیکھا تو وہ غائب تھی۔ بہت پریشان ہوا۔ اُسی وقت بھاگا بھاگا ندی پر گیا اور جنگلے پر جھک کر لگا گلا پھاڑنے:

”ہائے میرے چنے! میرے چنے واپس دو۔“

تھوڑی دیر بعد دیو کا سر پانی کی سطح پر اُبھرا۔ اُس کے چہرے پر غصّے کے آثار تھے۔ اُس نے گرج کر کہا:

”کیا شور مچا رکھا ہے؟ کیوں مُجھے تنگ کرتے ہو۔“

محمود نے چلّا کر کہا۔ ”میرے چنے واپس دو۔ میں اپنے چنے لے کر رہوں گا۔“

دیو نے اُسے پہچانتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، تو یہ تم ہو۔ وہ میز کیا ہوئی جو میں نے تمہیں دی تھی؟“

”وہ تو کسی نے چُرا لی۔“ محمُود نے رونی صورت بنا کر کہا۔ ”مجھے میرے چنے واپس دو۔“

دیو نے پانی میں ڈبکی لگائی اور تھوڑی دیر بعد ہاتھ میں چھوٹی سی چکّی لیے پانی کی سطح پر آ گیا۔

”لو۔۔۔ یہ لو۔۔۔ اس کے بعد تمہیں کِسی چیز کی ضرورت نہ رہے گی۔ اگر تُم اس کو سیدھے ہاتھ گھُماؤ گے تو سونا نکلے گا، اُلٹے ہاتھ گھماؤ گے تو چاندی۔۔۔ اب جاؤ، اپنی راہ لو اور مجھے آرام کرنے دو۔“ محمُود دوبارہ اُسی گاؤں میں گیا اور ایک جگہ بیٹھ کر چکّی پیسنے لگا۔ جب اُس نے چکّی کو سیدھی طرف گھُمایا تو آٹے کی جگہ سونا نکلا اور اُلٹا گھمایا تو چاندی۔ یہ سونا چاندی اُس کی ضرورت کے لیے کافی تھا۔ اُس کو بیچ کر اُس نے اچھے اچھے کپڑے خریدے اور ایک شان دار بنگلا بھی بنوا لیا۔ اب وہ بڑی شان سے گاؤں میں رہنے لگا۔

دیہاتیوں کو معلوم ہو گیا کہ احمق اجنبی واپس آ گیا ہے اور اس کے پاس بے شمار دولت ہے۔ وہ چوری چوری اُس پر نظر رکھنے لگے، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اُس کی امیری کا راز کیا ہے۔ جلد ہی جادُو کی چکّی کا پتا چل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چکّی کو سیدھا چلاؤ تو وہ سونا اُگلتی ہے اور اُلٹا چلاؤ تو چاندی۔ چناں چہ ایک رات جادُو کی چکّی بھی چوری ہو گئی۔

محمُود صُبح سو کر اُٹھا تو چکّی غائب تھی۔ وہ بھاگتا ہوا سیدھا ندی پر پہنچا اور پُل کے جنگلے پر جھُک کر چیخا "میرے چنے دے دو۔ میرے چنے دے دو۔"

وہ کُچھ دیر تک چلّاتا رہا۔ آخر دیو کا سر پانی کی سطح پر اُبھرا۔

"اب کیا چاہیے؟" اس نے گرج کر پُوچھا۔ "تم مُجھے چین نہیں لینے دو گے؟"

"میں اپنے چنے لے کر رہوں گا۔" محمُود نے کہا۔

"اس چکّی کا کیا بنا جو میں نے تمھیں دی تھی؟ دیو نے پُوچھا۔

"وہ بھی چوری ہو گئی۔" محمُود دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"اچھا، ٹھہرو!" یہ کہہ کر دیو نے پانی میں ڈُبکی لگائی اور ایک لمحے بعد دوبارہ اوپر آیا تو اُس کے ہاتھ میں دو چھڑیاں تھیں۔

"یہ لو۔" دیو نے چھڑیاں دیتے ہوئے کہا۔ "اور اب جاؤ مجھے آرام کرنے دو۔"

محمود نے چھڑیاں لیں، اُنہیں گھُما پھرا کر دیکھا اور پھر سوچا، بھلا یہ میرے کس کام آئیں گی؟ ان سے میں کیا کام لے سکتا ہوں؟ اس نے ایک ہاتھ میں ایک اور دوسرے ہاتھ میں دوسری چھڑی پکڑ لی اور دیکھنے لگا۔

"ہاں! ٹھیک ہے! اب سمجھا!" اُس نے اپنے آپ سے کہا "اب میں ان بدمعاشوں کے پاس جاتا ہوں جنہوں نے میری جادُو کی میز اُڑا لی اور جادُو کی چکّی بھی چُرا لی۔ میں اُن چھڑیوں سے اُن کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

محمُود کے آنے کی خبر گاؤں میں پھیلی تو سارے لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب کو بے چینی تھی کہ دیکھیں، اب یہ احمق کیا جادُوگری دکھاتا ہے۔

اب کے انہوں نے ایسا جادُو دیکھا کہ ساری عُمر یاد کرتے رہے۔ محمُود چھڑیاں ہوا میں لہرا کر چیخا:

"اے میری پیاری چھڑیو! ان کو پیٹو"!

اس کا یہ کہنا تھا کہ چھڑیا اُس کے ہاتھ سے نِکل کر تڑا تڑ لوگوں کے سروں پر برسنے لگیں۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ "رحم! رحم"!

چھڑیوں کو بس برسنے سے کام تھا۔ کسی کی ناک پر پڑیں تو وہ چلّایا۔ "ہاے مرا!" کسی کے سر پر پڑیں تو وہ چیخا۔ "ہائے میرے اللہ۔"

مُحمود اُنہیں روتا دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ ندی والے دیو نے اب کے کیا عُمدہ تُحفہ دیا تھا۔ سب اپنے آپ پِٹ رہے تھے اور رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔

"رحم؟ بدمعاشو!" محمُود نے لوگوں کا مُنہ چڑاتے ہوئے کہا "میں تم پر رحم کروں گا لیکن ایک شرط ہے۔ میری جادُو کی میز اور چکّی ابھی اِسی جگہ حاضر کرو، ورنہ پٹتے رہو۔"

مار کھا کھا کر دیہاتوں کا بھُرکس نکل چکا تھا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”تم جو کچھ کہو گے، ہم کرنے کو تیّار ہیں۔ خُدا کے لیے ان چھڑیوں کو روک دو۔“

محمُود نے چھڑیوں کو حکم دیا۔ ”رُک جاؤ!“ اور وہ رُک گئیں۔ لوگ گِرتے پڑتے گئے اور میز اور چکّی لا کر محمُود کے حوالے کی۔

دیو کے تینوں تحفے لے کر محمُود نے سوچا کہ اب چوروں کی اِس بستی میں نہیں رہنا چاہیے۔ اپنے گھر چلنا چاہیے۔ وہ تحفے لے کر سُلیمان کے پاس چلا گیا۔ وہ بھی گھوم گھام کر خالی ہاتھ گھر واپس آ گیا تھا۔

جادُو کی میز، جادُو کی چکّی اور جادُو کی چھڑیوں کے ہوتے محمُود کو کس چیز کی کمی تھی۔ اُس نے وہ ساری دولت، جو اُسے درخت کے تنے میں سے مِلی تھی، بھائی کو دے دی۔ اس طرح دونوں بھائی امیر ہو گئے۔

محمُود کے پاس ابھی ایک چیز کی کمی تھی، اور وہ تھی ایک اچھی اور عقل مند بیوی، جو اُس کو بے وقوفی کے کاموں سے روکے اور اُونچ نیچ سمجھاتی رہے۔ آخر سُلیمان نے اُس کے لیے ایسی ایک لڑکی تلاش کر ہی لی۔ جب وہ محمُود کے لیے دُلہن

تلاش کر رہا تھا تو اُسے بھی ایک اچھّی سی بیوی مل گئی۔ دونوں بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں اور دونوں اپنے اپنے گھر ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

موچی اور قاضی

تُرکی کے ایک شہر، استنبول میں ایک موچی رہتا تھا۔ وہ استنبول کا رہنے والا نہ تھا، بلکہ کِسی دُور دراز گاؤں سے یہاں پیسے کمانے آیا تھا۔ وہ دِن رات محنت کر کے جو کُچھ کماتا، اُسے سنبھال کر رکھتا اور اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتا۔ اس خیال سے اُس کے دِن آرام سے گُزر رہے تھے کہ وہ گھر والوں کے لیے کافی رقم لے کر جائے گا۔

کئی برس گزر گئے۔ اب اُس کے پاس پانچ سو روپے جمع ہو چکے تھے۔ لیکن افسوس! پانچ سو روپے جمع ہو جانے کی جتنی خُوشی تھی، اتنی ہی انہیں حفاظت سے رکھنے کی فکر اُسے کھائے جا رہی تھی۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی اس کی خُون پسینے کی کمائی کو چُرا کر لے جائے۔ آخر سوچ سوچ کر اُس کے ذہن میں یہ تجویز آئی کہ وہ رقم کو کسی ایمان دار آدمی کے پاس رکھ دے اور گاؤں واپس

جاتے وقت لے لے۔

اُس نے سوچا، شہر کے قاضی سے زیادہ ایمان دار کون ہو سکتا ہے۔ بس اُس نے روپُوں کی تھیلی اُٹھائی اور قاضی کے دروازے پر جا دستک دی۔ قاضی نے پُوچھا تو اُس نے جواب دیا:

"قاضی صاحب، چند برس پہلے میں استنبول میں روزی کمانے کی غرض سے آیا تھا۔ دن رات محنت کر کے میں نے کچھ رقم جمع کی ہے۔ ایک سال اور محنت کروں گا۔ پھر اِس قابل ہوں گا کہ گاؤں جا سکوں۔ جناب، آپ سے میری اتنی سی درخواست ہے کہ میری رقم اپنے پاس امانت رکھ لیں۔"

قاضی نے کہا۔ "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے بھروسے نے قابل سمجھا۔ اپنی پونجی میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ گاؤں جاتے وقت لے لینا۔"

موچی کے سر سے منوں بوجھ اُتر گیا۔ اُس نے تھیلی قاضی کو دی اور شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

استنبول میں دو اور دیہاتی بھی رہتے تھے جو موچی ہی کے گاؤں سے یہاں محنت مزدوری کرنے آئے تھے۔ انہوں نے ایک دن موچی سے کہا کہ چلو، اب گاؤں چلیں اور گھر والوں کی خیر خبر لیں۔ اب ہمارے پاس کافی پیسے جمع ہو گئے ہیں۔ موچی کو بھی گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ اس نے سوچا، پانچ سو رُوپے اچھی خاصی رقم ہے۔ اب گھر چلنا چاہیے۔ دوستوں کے ساتھ راستہ اچھا کٹ جائے گا۔

وہ قاضی کے پاس گیا اور درخواست کی کہ اُس کے پانچ سو روپے، جو وہ اُن کے پاس امانت رکھ گیا تھا، واپس کر دیں۔ وہ اب اپنے گاؤں جا رہا ہے۔

موچی کا رُوپے مانگنا تھا کہ قاضی غصّے سے آگ بگولا ہو گیا اور بولا ”کیا بکتا ہے؟ کون سے روپے؟“

موچی کانپتے ہوئے بولا۔ ”جناب، وہ روپے جو میں آپ کے پاس امانت رکھ گیا تھا۔“

یہ سُن کر قاضی چیخنے لگا۔ ”دفع ہو جا میری نظروں سے، ورنہ دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔ بے ایمان۔۔۔ جھوٹا۔۔۔“

موچی بے چارہ مجبور تھا۔ بھلا قاضی کے خلاف اُس کی فریاد کون سُنتا۔ اُس نے یہ سوچ کر کہ برائی کا بدلہ خُدا خود دے گا، اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا اور پھر پہلے کی طرح پائی پائی جمع کرنے لگا۔

ایک دن وہ دکان میں بیٹھا آہیں بھر رہا تھا کہ ایک سوداگر کی بیوی جوتا خریدنے آئی۔ وہ نرم دل خاتون تھی۔ اس نے موچی کو اداس دیکھا تو نرمی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ اتنی ٹھنڈی آہیں کیوں بھرتے ہو؟“

موچی پہلے تو کچھ جھجکا، لیکن جب خاتون نے اصرار کیا تو ساری کہانی اُسے کہہ سُنائی۔ خاتون نے کچھ دیر سوچا۔ پھر بولی: ”کل صُبح تُم قاضی کے گھر جانا اور اپنے روپے مانگنا۔ لیکن اس طرح مانگنا جیسے پہلی بار مانگنے آئے ہو۔“ یہ کہہ کر خاتون گھر آئی، اپنے قیمتی زیورات جمع کیے اور پھر نوکرانی کو بُلا کر کہا:

”کل میں قاضی صاحب کے ہاں جارہی ہوں۔ میرے ساتھ چلو گی۔ اور ہاں، دھیان سے سُنو، جب میں قاضی کے گھر میں داخل ہو جاؤں تو تم باہر کھڑی رہنا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی آئے گا اور گھر کے اندر چلا جائے گا۔ جوں ہی وہ گھر سے باہر نکلے، تم بھاگتی ہوئی آنا اور کہنا کہ بیگم صاحبہ، آپ کے شوہر مِصر سے واپس آگئے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

اگلی صُبح سوداگر کی بیوی زیورات کا تھیلا لے کر قاضی کے گھر پہنچی۔ قاضی نے پوچھا:

”بیگم صاحبہ، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں آپ سے ایک معاملے میں مدد کی اُمّید لے کر حاضر ہوئی ہوں۔“ خاتون

نے کہا۔

”جو کچھ میرے بس میں ہو گا، کرنے کی کوشش کروں گا۔“ قاضی نے جواب دیا۔

”بات یہ ہے قاضی صاحب کہ میرے شوہر تجارت کے لیے مِصر گئے ہیں۔ وہ وہاں کافی دن رہیں گے۔ انہوں نے مجھے مِصر بُلایا ہے۔ لیکن مجھے ایک چیز کی فکر ہے۔ دیکھیے نا، میں اِن زیورات کا کیا کروں؟“

یہ کہہ کر سوداگر کی بیوی نے تھیلا کھولا اور سارے زیور قاضی کے سامنے میز پر اُلٹ دیے۔ پھر بولی:

"اندازہ کیجیے، یہ بے حد قیمتی ہیں۔ میں ان کو گھر میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی اور نہ اتنے لمبے سفر میں ساتھ رکھ سکتی ہوں۔ اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر رہی ہوں۔ آپ سے زیادہ نیک اور ایمان دار آدمی اس شہر میں اور کوئی نہیں۔ اس لیے گزارش ہے کہ میری واپسی تک یہ زیورات اپنے پاس رکھ لیں۔"

جس وقت قاضی آنکھیں پھاڑے زیورات کو دیکھ رہا تھا، عین اسی وقت موچی کمرے میں داخل ہوا اور ادب سے جھک کر قاضی کو سلام کیا۔

قاضی نے بڑے اخلاق سے کہا۔ "کیوں میرے دوست، میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"قاضی صاحب، میں کل اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔" موچی نے کہا۔ "اور اپنے پانچ سو روپے جناب سے واپس لینے آیا ہوں، جو آپ نے اپنے پاس رکھ کر مجھ غریب پر احسان کیا تھا؟"

"اوہو! تو تم وقت سے پہلے ہی جا رہے ہو۔" قاضی نے کہا۔ "پھر اُس نے خزانچی کو آواز دے کر بُلایا اور حکم دیا کہ موچی کی رقم اِسے واپس کر دی جائے۔ موچی نے اپنے روپے گِن کر تھیلی میں ڈالے اور سلام کر کے چلا گیا۔

"کتنی عجیب بات ہے! ایک عام آدمی بھی مجھ پر بھروسا کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک معمولی موچی کسی رسید کے بغیر اپنی عُمر بھر کی کمائی میرے پاس رکھ جاتا ہے، کیوں کہ اُسے یقین تھا کہ اس کا روپیہ مانگنے پر فوراً مل جائے گا۔۔۔"

ابھی قاضی کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ نوکرانی باہر سے دوڑتی ہوئی آئی اور بولی "مالکن! مالکن! مالک مِصر سے واپس آ گئے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں؟"

خاتون نے کہا "ہائے! کتنی خُوشی کی بات ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے میز پر سے زیور سمیٹے اور قاضی کو سلام کر کے چلی گئی۔

ایک لمحے تک تو قاضی چکرایا رہا کہ یہ ہوا کیا؟ کچھ دیر بعد اُسے احساس ہوا کہ ٹھگ کو ٹھگ لیا گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اُسے اتنا غصّہ آیا کہ وہ اپنی

داڑھی کے بال نوچنے لگا۔

تین سنہری پریاں

ایک بادشاہ تھا۔ اس کے پاس خُدا کا دیا بُہت کچھ تھا، مگر اولاد نہ تھی۔ بادشاہ ہر وقت غمگین رہتا۔ وہ اُس غریب آدمی سے بھی حسد کرتا جو کسی بیٹے کا باپ ہوتا۔ وہ کہتا، مال و دولت کس کام کی جب سنبھالنے والا ہی کوئی نہیں۔

ایک دِن جب وہ شاہی دستر خوان سے طرح طرح کے لذیذ کھانے کھا چُکا تو حقّہ پیتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وزیر اُس کے قریب کھڑا تھا۔ بادشاہ نے وزیر کو سیر کے لیے چلنے کو کہا۔ وہ اس سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

بادشاہ اور وزیر باتیں کرتے کرتے محل سے بہت دور نِکل گئے۔ چلتے چلتے ایک بڑی سی وادی میں داخل ہوئے اور پھر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ وہ اپنے گرد پھیلے ہوئے حسین نظاروں سے لطف اُٹھا رہے تھے اور خُدا کی قدرت کی تعریف کر رہے تھے کہ ایکا ایکی اُن کے پاؤں تلے زمین کانپنے لگی۔ ساتھ ہی سائرن کی سی آواز سُنائی

دی۔ پھر اڑاڑادھم کی آواز فضامیں پھیل گئی۔ آواز کے ساتھ دھوئیں کا بادل سا اُٹھااور پھٹ گیا۔ اس میں سے ایک جادُوگر بر آمد ہوااور اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس جادُوگر کی سفید داڑھی تھی اور وہ سر سے پاؤں تک سبز لباس پہنے ہوئے تھا۔ صرف پاؤں میں زرد رنگ کی نوک دار جُوتیاں تھیں۔

بادشاہ اور اُس کا وزیر حیران رہ گئے۔ وہ اس طرح بیٹھے تھے جیسے پتھّر کے بُت ہوں۔ جادُوگر ہولے ہولے چل کر اُن کے پاس آیااور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"السّلامُ علیکمُ۔" اُس نے کہا۔

"وعلیکم السّلام۔" بادشاہ اور وزیر نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

جادوگر نے پوچھا۔ "حضُور، یہ بتایئے کہ آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "اگر آپ یہ جانتے ہیں کہ میں بادشاہ ہوں تو پھر آپ یہ

بھی جانتے ہوں گے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔"

جادُوگر کچھ نہ بولا۔ اس نے اپنے چُغے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سیب نکال کر بادشاہ کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ سیب گھر لے جایئے۔ اس کو دو حصّوں میں کاٹ کر آدھا خُود کھایئے اور آدھا ملکہ کو پیش کیجیے۔"

اس کے بعد ایک بار پھر زمین لرزنے لگی۔ سائرن سا بجا۔ زور کا دھماکا ہُوا اور جادُوگر دھوئیں کے بادل میں غائب ہو گیا۔

سکتے کے عالم میں بادشاہ اور وزیر محل کی طرف روانہ ہوئے۔ محل میں پہنچ کر بادشاہ نے جادُوگر کی بات پر عمل کیا۔ خُدا کا کرنا کیا ہوا کہ ابھی سال بھی ختم نہ ہوا تھا کہ اللہ نے اُس کو چاند سا بیٹا عطا کر دیا۔

اس موقع پر جس طرح جشن منایا گیا اور خوشیاں کی گئیں اُن کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ بادشاہ نے خزانوں کے مُنہ کھول دیے۔ تمام غریبوں محتاجوں کے گھر بھر دیے۔ سینکڑوں غلام آزاد کر دیے۔ دوستوں اور رشتے داروں کی شان دار دعوتیں کیں۔ چار دن اور چار راتیں کھیل تماشے ہوتے رہے۔

ننھا شہزادہ ناز و نعمت میں پرورش پانے لگا۔ اُس کے لیے ہر طرف محبّت تھی، آرام تھا، عیش تھا۔ جب وہ چودہ برس کا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے کہا:

”بابا جان، میرے دل میں ایک تمنّا ہے۔“

”بتایئے۔ آپ کے دل میں کون سی خواہش ہے؟ ہم فوراً پوری کر دیں گے۔“ بادشاہ نے بڑی محبّت سے کہا۔

شہزادے نے جواب دیا ”ابّا حضُور، میں چاہتا ہوں کہ میرے لیے سنگِ مرمر کا ایک چھوٹا سا محل بنوایا جائے۔ اس میں دو فوّارے ہوں۔ ان میں سے ایک میں مکھّن بھرا رہے اور دوسرے میں شہد۔“

بادشاہ نے اُسی وقت راج مزدور منگوائے اور حکم دیا کہ جلد سے جلد ایسا محل تیار کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی، سنگِ مرمر کا سفید محل تیّار ہو گیا۔ اس میں دو فوّارے بھی بنا دیے گئے۔ ان میں سے ایک سے مکھّن نِکلتا اور دوسرے سے شہد۔ شہزادہ پہروں ان فوّاروں کو دیکھتا رہتا۔

ایک روز شہزادہ فوّاروں کو دیکھ رہا تھا کہ ایک بڑھیا گھڑا لے کر محل میں آئی اور مکھّن کے فوّارے پر جھک کر گھڑا بھرنا چاہا۔ شہزادے کو بے حد غصّہ آیا۔ اس نے پتھّر اُٹھا کر بڑھیا کی طرف پھینکا۔ پتھّر کا لگنا تھا کہ گھڑے کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ بڑھیا خاموش رہی اور اُداسی سے قدم اُٹھائی ہوئی چلی گئی۔

دوسرے روز وہی بُڑھیا اُسی طرح گھڑا لیے محل میں داخل ہوئی اور شہد والے فوّارے سے گھڑا بھرنے کے لیے جھُکی۔

شہزادے نے پھر ایک پتھّر گھُما کر بُڑھیا کے گھڑے پر مارا۔ گھڑا ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ بڑھیا نے ایک لفظ نہ کہا اور جِدھر سے آئی تھی، اُدھر ہی واپس چلی گئی۔

تیسرے دِن بڑھیا پھر آئی۔ شہزادے نے اُس روز بھی اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو پہلے کیا تھا لیکن آج بُڑھیا خاموش نہیں رہی۔ محل سے نکلتے اُس نے شہزادے کو بد دُعا دی: ’’شہزادے! خُدا کرے تُجھے تین سنہری پریاں کبھی چین نہ لینے دیں۔‘‘

بڑھیا کا یہ کہنا تھا کہ بادشاہ کے پیارے اور اکلوتے بیٹے نے چُپ سادھ لی۔ وہ ہر

وقت تھکا تھکا رہتا۔ بے دِلی سے کھاتا پیتا۔ آخر سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ بادشاہ کے ہوش اُڑ گئے۔ اُس نے دور دور سے بڑے بڑے طبیب اور سیانے بُلائے اور اُن سے دریافت کیا کہ شہزادے کو کیا بیماری ہے۔ یہ لوگ لاکھ سوچتے، سر مارتے رہے لیکن شہزادے کے دُکھ کا سبب نہ جان سکے۔

ایک روز شہزادے نے بادشاہ کو بتایا کہ اُس کا علاج سیانوں اور طبیبوں کے پاس نہیں ہے۔ اُس پر بادشاہ نے بے تاب ہو کر کہا:

"بیٹے، مجھے صرف اِتنا بتا دے کہ تُجھے کیا دُکھ ہے؟ میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میں تیری وجہ سے بے حد رنجیدہ ہُوں۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہُوا جا رہا ہے۔"

اس پر شہزادے کا دل بھر آیا۔ اُس نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا "پیارے ابّا جان، میرا غم عجیب و غریب ہے۔ مُجھے تین سنہری پریاں چاہئیں، جنہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ صِرف اُن کے بارے میں سُنا ہے۔ میں اُن کو حاصل کروں گا ورنہ جان دے دوں گا۔"

یہ سُن کر بادشاہ کی پریشان اور بڑھ گئی۔ اُسے خوف تھا کہ اُس کا پیارا بیٹا پریوں کی تلاش میں اُس سے جُدا ہو جائے گا۔ اُس نے بیٹے کو سمجھایا کہ تُم میری آنکھوں کا نور اور کلیجے کی ٹھنڈک ہو۔ مُجھ سے جُدا نہ ہو اور پریوں کا خیال دِل سے نِکال دو۔

لیکن بیٹا نہ مانا۔ اُس کی طبیعت پہلے سے بھی زیادہ گری گری رہنے لگی۔ چہرہ زرد اور آنکھیں مُرجھا گئیں۔ اب وہ سارا دن چُپ چاپ پلنگ پر لیٹا رہتا۔ اس کی حالت دیکھ کر بادشاہ کی اپنی حالت بگڑنے لگی۔ آخر سُوچ سوچ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ بیٹے کو گھُل گھُل کر مرنے سے بچائے اور پریوں کی تلاش میں جانے دے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔

بادشاہ نے دِل پر پتھّر رکھ کر شہزادے کو سفر پر روانہ ہونے کی اجازت دی۔ اس نے جلدی جلدی ضُرورت کی چیزیں باندھیں، کچھ ہیرے جواہرات ساتھ لیے اور خوشی خوشی روانہ ہو گیا۔

وہ کئی دن، کئی راتیں سفر کرتا رہا۔ راستے میں کئی پہاڑ، کئی وادیاں آئیں۔ دِن بھر

سفر کرتا اور شام ڈھلتے ہی کہیں پڑاؤ ڈال دیتا۔ اسی طرح چلتے چلتے ایک دن ایک کُشادہ میدان میں جا نِکلا۔

اِس میدان میں شہزادے کا سامنا ایک دیونی سے ہوا۔ یہ دیونی بُہت بڑی اور بُہت خوف ناک تھی۔ اُس کا ایک پیر ایک پہاڑ پر تھا اور دوسرا پیر دوسرے پہاڑ پر۔ جب وہ سانس لیتی تو زور کا جھکڑ چلنے لگتا۔

شہزادے نے بڑے ادب سے کہا۔ ”بڑی بی، سلام عرض کرتا ہوں۔ کیسے مزاج ہیں؟“

دیونی نے جواب دیا۔ ”جیتے رہو، بیٹے۔ اچھی ہوں۔“

اس کی آواز سے پہاڑ ہلنے لگے۔ پھر اُس نے کہا۔ ”حیرت ہے کہ تُم میرے ساتھ اِتنی تمیز سے بات کرتے ہو۔ تُمہاری عُمر کے لڑکوں کو تو بات بھی کرنی نہیں آئی۔ اچھّا بچّے، یہ بتاؤ کہ تُم کہاں جا رہے ہو؟“ شہزادے نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”بڑی بی، میں ایک مُصیبت میں اُلجھا ہوا ہوں۔“

دیونی نے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ تو سہی، کون سی ایسی مُصیبت ہے؟ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

شہزادے نے اُداس ہو کر سر جھکا لیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "بڑی بی، میں تین سنہری پریوں کی تلاش میں نِکلا ہوں۔ اُن کے بغیر میرا جینا مُحال ہے۔ اُن کے لیے میں نے محل چھوڑا، آرام چھوڑا، پیار کرنے والے ماں باپ چھوڑے۔ میں بے حد دُکھی ہوں۔"

"اوہو! یہ تو بہت مشکل کام ہے۔" دیونی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں پرستان کے راستے پر پہرا دے رہی ہُوں لیکن میں بھی نہیں جانتی وہ سنہری پریاں کہاں ہیں۔ میرے چالیس بیٹے ہیں، جو اس مُلک میں گھُومتے پھرتے ہیں۔ وہ شاید کچھ بتا سکیں۔ آج رات تم یہیں ٹھہرو۔ شام کو وہ واپس آئیں گے تو اپنی بپتا اُن سے کہنا۔"

شہزادہ دیونی کے چالیس بیٹوں کا انتظار کرنے لگا۔ جب سُورج نے اپنی روشنی سمیٹ لی اور رات نے ڈیرا ڈالنا شروع کیا تو دیونی نے اپنی اُنگلی اُٹھائی اور

شہزادے کی پیشانی کو چھُوا۔ شہزادہ اُسی وقت پانی کا گھڑا بن گیا۔ دیونی کے چالیس بیٹے وادی میں واپس آئے تو شہزادہ گھڑے کی شکل میں دیونی کے پاس ہی پڑا ہوا تھا۔

دیونی کا بڑا بیٹا آتے ہی بولا۔ ”آدم بُو! آدم بُو! یہاں کہیں ضُرور کوئی آدم زاد چھُپا ہُوا ہے۔

باقی بیٹے بھی دھاڑنے لگے۔ ”آدم بُو! آدم بُو! ہمیں انسان کی بُو آرہی ہے۔“

پھر وہ ہر طرف آدمی کو تلاش کرنے لگے۔ اُنھوں نے پہاڑوں، ڈھلانوں اور وادیوں میں کھُوج لگایا مگر انسان نہ مَلا۔ تھک ہار کر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ جب خُوب پیٹ بھرا اور تسلّی سے ایک طرف بیٹھے تو ماں نے آہستہ سے پوچھا:

”بیٹا، اگر میں تُم سے کہوں کہ تُمہارا ایک بھائی اور بھی ہے، اور وہ انسان ہے تو کیا کروگے؟“

بڑے بیٹے نے جواب دیا۔ ”اگر وہ ہمارا بھائی ہے تو ہم اُس کو پیار کریں گے اور اُس

کی حفاظت کریں گے۔"

دُوسرے اُنتالیس بھائیوں نے بھی ایک آواز ہو کر کہا۔ "بالکُل۔ بالکل۔ بڑا بھائی ٹھیک کہتا ہے۔ ہم اُس کو پیار کریں گے۔"

پلک جھپکتے میں اُن کے سامنے ایک خوبصُورت شہزادہ کھڑا تھا۔ دیونی نے کہا۔ "لو، میرے بچّو! یہی تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔"

دیونی کے چالیس بیٹے اس چھوٹے سے پیارے بھائی کو پا کر بے حد خوش ہوئے۔ ہر دیو شہزادے کی خاطر مدارات کرنا چاہتا تھا۔ ایک اُٹھا اور بھیڑ پکڑ لایا۔ دوسرے نے آگ جلادی۔ باقیوں نے بھیڑ کی کھال اُتاری اور بوٹیاں بنا کر انہیں آگ پر بھُونا۔ پھر خُوشی خُوشی شہزادے کو بھُنا ہوا گوشت کھلایا۔ شہزادہ پیٹ بھر کے کھا چُکا تو دیونی کے چالیس بیٹے باقی گوشت کو دو لُقموں میں چٹ کر گئے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

اگلی صُبح دیونی نے اپنے بیٹوں کو اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ تمہارا چھوٹا بھائی تین سنہری پریوں سے ملنا چاہتا ہے۔ بیٹوں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے جواب

دیا:

”ماں جی، ہم بھی نہیں جانتے کہ وہ تین سنہری پریاں کہاں رہتی ہیں۔ لیکن اتنا کر سکتے ہیں کہ اپنے بھائی کو خالہ جان کے پاس لے جائیں۔ شاید وہ کچھ بتا سکیں۔“

دیونی نے کہا ”اچھا بیٹا، اس کو خالہ کے پاس لے جاؤ۔ اس سے کہنا کہ اِس کی ہر مُمکِن مدد کرے۔“

ماں سے اجازت لے کر چالیس دیو شہزادے کو اُن پہاڑوں پر لے گئے جہاں اُن کی خالہ رہتی تھی۔ اُنہوں نے خالہ کو شہزادے کے دکھ کا قصّہ سُنایا اور کہا کہ کسی طرح اِسے سنہری پریوں تک پُہنچادو۔ خالہ نے مجبُوری ظاہر کرتے ہوئے کہا:

”بیٹا، میں بھی نہیں جانتی کہ تین سنہری پریاں کہاں ہوتی ہیں۔ یہ آج میرے پاس ٹھہرے۔ شام کو میرے ساٹھ بیٹے آئیں گے۔ وہ شاید اس کی مدد کر سکیں۔ لیکن پہلے میں اس لڑکے کو کہیں چھُپادوں، ورنہ میرے بیٹے اِسے ہڑپ کر جائیں گے۔“

یہ کہہ کر دیونی خالہ نے شہزادے کے ماتھے کو اُنگلی سے چھُوا۔ شہزادہ ایک دم گلاس بن گیا۔ دیونی کے چالیس بیٹے مُطمئن ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔

شام کو دیونی خالہ کے ساٹھ بیٹے گھر لوٹے تو چلّانے لگے۔ ”آدم بُو! آدم بُو! ہمیں انسان کے گوشت کی بُو آ رہی ہے۔ ماں جی، ہمیں انسان کے گوشت کی بُو آ رہی ہے۔“

دیونی نے کہا۔ ”احمقو، تمہیں بھُوک لگی ہے۔ کھانا تیّار ہے۔ آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔“

سارے دیو دستر خوان پر بیٹھ گئے اور مزے مزے سے کھانا کھانے لگے۔ دیونی نے گلاس کو انگلی سے بجایا۔ اُسی وقت شہزادہ اپنی اصلی شکل میں آ گیا۔ ساٹھوں بیٹے خوب صُورت شہزادے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اُسے پاس بٹھا کر کھانا کھلانے لگے۔ کھا پی کر سیر ہو گئے تو بستروں پر لیٹ کر سو گئے۔

صُبح ہوئی تو دیونی نے اپنے بیٹوں کو بتایا کہ شہزادہ سنہری پریوں سے ملنا چاہتا ہے اور اُن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ”افسوس! ماں جی۔“ ساٹھ دیو اکٹھّے بولے۔

ہم سنہری پریوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ وہ کہاں رہتی ہیں۔ لیکن ہم شہزادے کو بڑی خالہ کے پاس لے جاتے ہیں۔ وہ بڑی عقل مند ہیں۔ اس کی ضُرور مدد کریں گی۔"

دیونی نے کہا۔ "تم نے ٹھیک کہا۔ اس کو بڑی خالہ کے پاس لے جاؤ۔ اُن کو بتانا کہ اکسٹھواں بیٹا ہے۔ اسے بھی اپنا ہی بیٹا سمجھیں اور مہربانی سے پیش آئیں۔"

دیونی خالہ کے ساٹھ بیٹے شہزادے کو ساتھ لے کر اُس پہاڑ پر گئے جہاں اُن کی بڑی خالہ رہتی تھی۔ بڑی خالہ نے بڑی محبّت سے شہزادے کا اِستقبال کیا اور اُس کی درد بھری کہانی سُنی۔ لیکن وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ تین سنہری پریاں کہاں رہتی ہیں۔ پھر بھی اُس نے شہزادے کو تسلّی دی۔

"بیٹا، اُمّید کا دامن نہ چھوڑو۔ آج کی رات یہاں ٹھہرو۔ شام کو میرے نوّے بیٹے واپس آئیں گے۔ اُن سے پریوں کا پتا پُوچھوں گی۔ شاید وہ جانتے ہوں۔" یہ کہہ کر دیونی نے اپنے بھانجوں کو رُخصت کیا۔ وہ سلام کر کے چلے گئے۔ جب دِن کی روشنی اندھیرے میں بدلنے لگی تو دیونی نے شہزادے کے ماتھے کو اُنگلی سے

چھُوا۔ شہزادہ جھاڑُو بن گیا۔

تھوڑی دیر بعد دیونی کے نوّے بیٹے آ گئے اور آتے ہی آدم بُو! آدم بُو! پُکارنے لگے۔ ماں نے جھٹ پٹ کھانا تیّار کیا اور اُنہیں کھلایا۔ جب وہ کھا پی چُکے تو دیونی نے پُوچھا:

"اگر تمہیں کوئی چھوٹا سا بھائی مِل جائے تو اُسے بھی کھا جاؤ گے؟"

"نہیں۔ ہر گز نہیں۔ کوئی اپنے بھائی کو بھی کھاتا ہے؟" نوّے کے نوّے بھائی ایک ساتھ چیخے۔

ماں نے کہا۔ "اچھا قسم کھاؤ کہ تم اُسے کُچھ نہیں کہو گے۔"

سب نے فوراً قسم کھائی۔ ماں نے جھاڑو پر ہاتھ مارا تو شہزادہ فوراً جھاڑو سے انسان بن گیا۔ دیوؤں کو ماں سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ انہوں نے شہزادے کو اپنے پاس بٹھا لیا تا کہ وہ بھی کھانا کھا لے۔ وہ پیار سے شہزادے کا حال پُوچھ رہے تھے۔ شہزادے نے لمبی سانس بھر کر جواب دیا:

”میں بیمار نہیں، مگر خُوش بھی نہیں۔ میری مُصیبت یہ ہے کہ میں تین سنہری پریوں سے مِلنا چاہتا ہوں۔“

دیونی نے کہا۔ ”لو، اپنے بھائی کی مدد کرو۔ تُم میں سے کون بتائے گا کہ تین سنہری پریاں کہاں رہتی ہیں؟“

”امُی جان، میں جانتا ہوں۔“ نوّے بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن صُبح سویرے دیونی کا سب سے چھوٹا بیٹا اور شہزادہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ دو گھنٹے تک چلتے رہے۔ پھر دیو نے شہزادے سے کہا۔

”بھائی، ہم بہت جلد ایک باغ میں پہنچ جائیں گے۔ باغ میں ایک فوّارہ چل رہا ہو گا۔ اُس فوّارے ہی میں تین سنہری پریاں رہتی ہیں۔ فوّارے پر جا کر میں تمہیں آنکھیں بند کرنے کے لیے کہوں گا۔ آنکھیں بند کر دینا۔ پھر میں کہوں گا، آنکھیں کھول دو، کھول دینا۔ جُوں ہی تُم آنکھیں کھولو گے، تمہارے دل کی مراد پوری ہو جائے گی۔“ چلتے چلتے راستہ بُہت چوڑا ہو گیا۔ اور پھر وہ ایک بُہت بڑے

باغ میں جا کر ختم ہو گیا۔ باغ کے عین درمیان میں فوّارہ چل رہا تھا۔ چاندی جیسے پانی کی بوندیں اُڑ اُڑ کر تالاب میں گر رہی تھیں۔ یہاں شہزادہ اور دیو دونوں چُپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیو نے کہا:

"آنکھیں بند کر لو۔"

شہزادے نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور یُوں ہی کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر دیو نے آواز دی:

"آنکھوں کھولو۔"

شہزادے نے آنکھیں کھول لیں۔ واہ وا! تالاب کے پانی میں تین سنگترے ڈُبکیاں لگا لگا کر نہا رہے تھے۔ اس نے فوراً پانی میں ہاتھ ڈالا اور تینوں سنگترے نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ دیو بولا:

"شاباش! اب سب کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ بس ایک بات یاد رکھنا۔ جب بھی تم اِن سنگتروں کو چھیلنے لگو تو خیال رکھنا کہ تمہارے آس پاس پانی ضرور ہو۔"

شہزادے نے دیو کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اُس کی ہدایت کے مطابق کام کرے گا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو خُدا حافِظ کہہ کر جُدا ہو گئے۔ دیو جس راستے سے آیا تھا، اُسی راستے سے واپس چلا گیا۔ شہزادہ باغ میں سے ہوتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہاں ایک سڑک تھی۔ وہ اس پر ہو لیا۔

یہ سڑک ایک پہاڑی پر سے گُزرتی تھی۔ پہاڑی کو پار کیا تو ایک ریگستان آ گیا۔ شہزادہ تپتی ہوئی ریت پر ایک گھنٹے سے زیادہ چلتا رہے۔ پیاس لگی تو اُسے تین سنگتروں کا خیال آیا۔ ایسے گرم خشک ریگستان میں رس بھرے سنگتروں سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور ایک سنگترے کو کاٹ کر دو حصّے کرنا چاہے۔

جوں ہی سنگترہ کٹا، ایک خوب صورت پری کُود کر باہر آ گئی۔ یہ سنہری پری اتنی حسین تھی کہ شہزادے کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ شہزادے کے سامنے تپتی ہوئی ریت پر کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ پھر اُس نے اِدھر اُدھر آنکھیں گھُما کر دیکھا اور شہزادے کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

"پانی۔ مُجھے پانی چاہیے۔"

لیکن شہزادہ تو ریگستان میں کھڑا تھا وہاں پانی کہاں؟ اب شہزادے کو دیو کی بات یاد آئی۔ دیو نے اسی لیے کہا تھا کہ جب تک پانی پاس نہ ہو، سنگترہ مت چھیلنا۔ شہزادہ بُہت پچھتایا۔ بے چاری پری اُس کی طرف اُداس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سخت پیاسی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ غائب ہو گئی۔ شہزادہ بے بسی سے ہاتھ ملنے اور اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چِڑیاں چُگ گئیں کھیت۔

پری جا چکی تھی۔ شہزادہ اُداس ہو کر پھر چلنے لگا۔ اُس بے اندازہ لمبے چوڑے ریگستان میں کہیں نخلستان کا نام نشان نہ تھا۔ شہزادے کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ جب جان لبوں پر آ گئی تو اُس کو دوسرے سنگترے کا خیال آیا۔ اس نے دل کو سمجھایا کہ کوئی بات نہیں۔ ایک سنگترہ تو پھر بھی بچ جائے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے سنگترے ہیں سے پری نہ نکلے۔ عجیب واقعات بار بار تو پیش نہیں آتے۔

یہ سوچتے ہوئے اُس نے دوسرا سنگترہ بھی کاٹ دیا۔ جُوں ہی سنگترہ کٹا، اُس میں سے ایک ننھی سی پری اُچھل کر باہر نکلی۔ یہ پری پہلی پری سے بھی زیادہ حسین تھی۔ شہزادہ چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور ٹُکر ٹُکر پری کو دیکھنے لگا۔ پری نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولی:

"پانی۔۔۔ مُجھے پانی پلاؤ۔"

شہزادہ بے بس تھا۔ وہ خود پیاسا مر رہا تھا۔ پانی ہوتا تو اُس پری کو پہلے دیتا۔ لیکن ہائے بدنصیبی! پری غائب ہو گئی۔

شہزادے نے اپنا سفر جاری رکھا اور دل میں پکّا ارادہ کر لیا کہ چاہے وہ پیاسا مر جائے، آخری سنگترے کو اس وقت تک نہیں چھیلے گا جب تک آس پاس پانی نہ ہو۔۔۔ ریگستان میں بھٹکتے بھٹکتے دوسرا دن بھی آدھا گزر گیا۔ اچانک اُسے چشمہ بہنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ گِرتا پڑتے چشمے تک پہنچا۔ چُلّو بھر بھر کر ٹھنڈا پانی پیا اور خُدا کا شکریہ ادا کیا۔ پیاس بجھانے کے بعد اُس نے جیب سے چاقو نکالا اور آخری سنگترہ کاٹا۔

جُوں ہی سنگترے کے دو حِصّے ہوئے، اُس میں سے ایک نازک سی پری اُچھل کر باہر آ گئی۔ یہ پری پہلی دونوں پریوں سے زیادہ نازک اور حسین تھی۔ اُس نے بھی ہاتھ بڑھا کر شہزادے سے پانی مانگا: "پانی۔۔۔ مُجھے پانی چاہیے۔"

شہزادہ اُسے چشمے پر لے گیا۔ اُس نے خُوب سیر ہو کر پانی پیا اور پھر شہزادے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ شہزادے نے فیصلہ کیا کہ اس پری کو کِسی ڈولی یا گاڑی میں لے جانا چاہیے۔ ورنہ لوگوں میں بے عزّتی ہو گی۔ یہ سوچ کر اُس نے پری سے کہا:

"میں تمہارے لیے گاڑی لینے جا رہا ہوں۔ تم یہیں انتظار کرنا۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔"

یہ کہ اُس نے پری کو چشمے کے پاس ایک درخت کی شاخ پر بٹھا دیا اور تاکید کی کہ یہاں سے ہر گز نہ ہلنا۔ پری درخت پر بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ کافی دیر ہو گئی کہ شہزادہ لوٹ کر نہ آیا۔ اتنے میں پری کو کسی کی آواز سنائی دی۔ یہ شہزادہ نہیں تھا بلکہ کوئی نوکرانی تھی جو اپنی مالکن کے لیے چشمے سے پانی لینے آئی تھی۔ نوکرانی

کے ہاتھ میں گھڑا تھا۔ جب وہ گھڑا بھرنے کے لیے جھُکی تو اُسے پانی میں پری کا عکس نظر آیا۔ نوکرانی نے سمجھا، یہ میرا ہی عکس ہے۔ وہ اِترا کر بولی:

"واہ! میں تو اپنی مالکن سے بھی زیادہ خُوبصُورت ہوں۔ اُسے میری خدمت کرنی چاہیے، نہ کہ مُجھے اُس کی۔"

یہ کہہ کر اُس نے گھڑا زمین پر دے مارا اور اپنی مالکن کے گھر چلی گئی۔ مالکن نے اُسے خالی ہاتھ آتے دیکھا تو سوال کیا:

"پانی کہاں ہے؟"

"گھڑا ٹوٹ گیا۔" نوکرانی نے زور سے جواب دیا۔ "میں تُم سے زیادہ حسین ہوں۔ تمہاری نوکر کیوں بنوں، تُم خود پانی لے آؤ۔"

"کیا کہنے ہیں تیرے!" مالکن چلّائی۔ "یہ کھچڑی آج یکایک حسین کیسے بن گئی!" یہ کہہ کر اُس نے نوکرانی کے سامنے آئینہ کر دیا۔

نوکرانی نے آئینے میں شکل دیکھی تو بے حد شرمندہ ہوئی۔ اُس نے دوسرا گھڑا

اُٹھایا اور چشمے سے پانی لینے چلی۔ چشمے پر وہی واقعہ پر پیش آیا۔ وہ گھڑا بھرنے جھکی تو پانی میں پری کا چہرہ دکھائی دیا۔

"میں حسین ہوں۔ میں یقیناً اپنی مالکن سے زیادہ حسین ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے دوسرا گھڑا بھی توڑ دیا اور مالکن کے پاس چلی گئی۔ مالکن نے پوچھا: "پانی کہاں ہے؟ اور دوسرے گھڑے کا کیا ہوا؟"

نوکرانی نے رُعب سے کہا۔ "تمہیں میرا پانی بھرنا چاہیے۔ میں تُم سے زیادہ حسین ہوں۔ پھر تمہاری خدمت کیوں کروں۔۔۔ واہ۔"

"میرا خیال ہے تُم پاگل ہو گئی ہو۔ ایک بار آئینہ پھر دیکھو۔" مالکن نے کہا۔

آئینہ دیکھ کر نوکرانی پھر شرمندہ ہوئی اور تیسری بار پانی بھرنے چشمے پر گئی۔ اِس دفعہ بھی اُسے پانی میں وُہی حسین چہرہ دکھائی دیا۔ اب وہ تیسرا گھڑا توڑنے ہی والی تھی کہ درخت پر بیٹھی سنہری پری نے کہا:

"نہ نہ۔ اب گھڑا مت توڑنا۔ پانی میں تُمہیں میرا چہرہ نظر آتا ہے۔ دوبارہ جھانکو تو۔"

لیکن نوکرانی نے پانی میں دیکھنے کے بجائے اُوپر درخت کی طرف دیکھا۔ اُس کی

نگاہ خوب صورت پری پر پڑی۔ وہ جلدی سے درخت پر چڑھ گئی۔ اُس نے دل میں کھوٹ تھی۔ اُس نے بڑی نرمی سے کہا:

”ننھّی پری، تُم تھکی ہوئی لگتی ہو۔ آؤ، میرے زانُو پر سر رکھ کر تھوڑی دیر آرام کرلو۔“

یہ کہا اور سنہری پری کا خُوب صُورت سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ جب پری، باتیں کرتی ہوئی، اس کی گود میں سو گئی تو نوکرانی نے اپنی جیب میں سے سوئی نکالی اور پری کے ماتھے میں چبھو دی۔

سوئی چبھتے ہی ننھّی پری ایک چھوٹا سا پرندہ بن گئی اور اُڑ کر دُور چلی گئی۔ نوکرانی درخت پر بیٹھی رہی۔ جب شہزادہ گاڑی لے کر واپس آیا تو نوکرانی سنہری پری کی جگہ بیٹھی تھی۔ شہزادہ اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بولا:

”یہ تمھیں کیا ہو گیا؟“

نوکرانی نے غُصّے نے کہا۔ ”ہاں ہاں۔ اب تو تم یہی کہو گے۔ مُجھے تن تنہا درخت پر

چھوڑ گئے۔ دِن بھر غائب رہے۔ اب پوچھتے ہو کیا ہُوا؟ دُھوپ بہت تیز تھی اور کیڑے مکوڑوں نے کاٹ کاٹ کر مُجھے بے حال کر دیا۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں سُکیڑے بیٹھی رہی۔ یہ ہوا میرے ساتھ۔"

شہزادہ بے حد شرمندہ ہُوا۔ اُس نے نوکرانی سے معافی مانگی اور اُسے گاڑی میں بٹھا کر اپنے باپ کے محل میں لے گیا۔

محل میں شہزادے اور اُس کی دُلہن کے اِستقبال کی زبردست تیّاریاں کی گئی تھیں۔ ہر شخص خُوش تھا کہ اُن کا محبوب شہزادہ پری کو لے ہی آیا۔ لیکن جب انہوں نے نوکرانی کو دیکھا تو بُہت حیرت ہوئی۔ جیسا سُنا تھا ویسی وہ ہر گز نہ تھی۔

بادشاہ نے بیٹے سے کہا۔ "یہ عقل مند شاید ہو لیکن خوب صُورت ہر گز نہیں۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "یہ عقل مند بھی ہے اور حسین بھی۔ قصور میرا ہے۔ میں نے اِسے تنہا چھوڑ کر غَلَطی کی۔ تیز دھوپ نے اِس کا رنگ کالا کر دیا ہے۔ آرام کرنے دیجیے۔ خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔"

بادشاہ کے محل کے گِرد خوب صُورت باغ تھا۔ ایک دن باغ کا مالی پودوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا کہ ایک سنہری پرندہ اُڑتا ہوا آیا اور اُس کے کندھے پر بیٹھ گیا۔ مالی نے خوش ہو کر کہا:

”ننھّی چڑیا، میں تمہاری کی خدمت کر سکتا ہوں؟“

”سنہری چڑیا نے جواب دیا۔ ”بڑے میاں، میں یہ معلُوم کرنا چاہتی ہوں کہ اِس وقت شہزادہ کیا کر رہا ہے؟“

مالی نے کہا۔ ”ننھّی چڑیا، میں اچھی طرح تو نہیں جانتا کہ شہزادہ کیا کر رہا ہو گا، ہاں اتنا جانتا ہوں کہ وہ کسی کو دُکھ نہیں دے رہا ہو گا۔“

پرندے نے پھر پُوچھا۔ ”اچھے مالی، مُجھے یہ تو بتا سکتے ہو کہ اِس وقت شہزادے کی دُلہن کیا کر رہی ہو گی۔“

”میرا خیال ہے، اس وقت وہ شہزادے کے پاس بیٹھی ہو گی۔“ مالی نے چڑیا کو بتایا۔ یہ سُن کر چڑیا گانے لگی:

وہ سمجھی اُس نے جیت لیا

پر ہے اُس کی بھُول

اور سدا بہار نہیں ہوتے

یہ مُسکانوں کے پھُول

ننّھی چڑیا نے گاتے ہوئے، باغ کے دو تین چکّر لگائے۔ پھر وہ گلاب کی ایک ٹہنی پر بیٹھ کر گانے لگی:

یہ پھُول جہاں میں میٹھی ہوں

یہ بھی تو مُرجھا جائیں گے

یہ گا کر ننّھی چڑیا اُڑتی ہُوئی باغ سے نِکل گئی۔ دُوسرے دن وہ پھر باغ میں آئی اور مالی سے شہزادے اور دُلہن کے بارے میں پوچھا۔ تیسرے دِن پھر آئی۔ ہر بار مالی وہی جواب دیتا، اور ہر بار سُنہری چڑیا وُہی گانا گا کر مالی کو سُناتی۔

بے چارہ مالی ننّھی چڑیا کی باتوں پر حیران تھا اور اپنے پھُولوں کی وجہ سے

پریشان۔ بادشاہ مالی کے لگائے ہوئے گلاب کے پودوں کی وجہ سے اُس کی بُہت عزّت کرتا تھا۔

ایک دن شہزادہ باغ میں اکیلا ٹہل رہا تھا۔ اچانک اُس کی نظر گلاب کے ان پودوں پر پڑی جن کے پھُول مُرجھا چُکے تھے۔ شہزادے نے اُسی وقت مالی کو بُلایا اور کہا:

"بڑے میاں، حیرت ہے کہ تُم گلاب کی صحیح دیکھ بھال نہیں کر رہے۔ دیکھو، ان تین پودوں کے پھُول مُرجھا چکے ہیں۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟"

مالی نے جواب دیا۔ "سرکار، یہ ایک سنہری چڑیا کی وجہ سے مُرجھائے ہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے شہزادے کو چڑیا کے بارے میں پوری تفصیل سُنا دی، اور یہ بھی بتایا کہ چڑیا درد بھرا گانا گاتی ہے اور جس گلاب کی ٹہنی پر بیٹھتی ہے وہ سُوکھ جاتا ہے۔

شہزادے نے مالی کو حکم دیا کہ باغ میں ایک پھندا لگاؤ اور جب چڑیا آئے تو اُسے پکڑ کر میرے سامنے پیش کرو۔ مالی نے شہزادے کے حکم پر درخت کی ٹہنی پر

پھندا لگا دیا۔ اگلے روز سنہری چڑیا پھر آئی۔ جوں ہی وہ ٹہنی پر بیٹھی پھندا بند ہو گیا اور چڑیا اُس میں پھنس گئی۔ مالی چڑیا کو پکڑ کر شہزادے کے پاس لے گیا۔ شہزادے نے چڑیا کو پنجرے میں بند کر دیا۔

شہزادے کی دُلہن نے جب اس ننّھی چڑیا کو دیکھا تو اُسے شک ہوا کہ ہو نہ ہو، یہ وہی سنہری پری ہے جس کے اُس نے سوئی چبھوئی تھی۔ اُس کو فِکر ہُوئی کہ اُس کا بھید کھُل جائے گا۔ وہ اس نئی مُصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے غور کرنے لگی۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ جھُوٹ موٹ بیمار پڑ جائے گی اور کہے گی کہ اُس کی تکلیف ننّھی چڑیا کا کلیجا کھا کر ہی دور ہو گی۔ اس مقصد کے لیے اُسے ڈاکٹروں کو رشوت بھی دینا ہو گی تا کہ وہ وہی علاج بتائیں جو وہ چاہتی ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر اُس نے محل کے ڈاکٹروں کے لیے قیمتی تحفے تیّار کیے اور اُن سے کہا کہ اگر میں اپنے مقصد میں کام یاب ہو گئی تو تمھیں مالا مال کر دوں گی۔

سب اِنتظام مکمل کر کے مکّار نوکرانی پلنگ پر لیٹ گئی اور شہزادے کو آتا دیکھ آنکھیں بند کر کے کراہنے لگی۔ شہزادے نے اپنی دلہن کو یُوں تڑپتے دیکھا تو

گھبرا کر بولا:

''میری دُلہن کو کیا تکلیف ہے؟''

''ہائے! ہائے! طبیبوں کو بلاؤ۔'' نوکرانی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے جیسے میرا آخری وقت آ گیا ہے۔''

طبیبوں کو فوراً بُلایا گیا۔ اُنھوں نے شہزادے کی دُلہن کو بے چینی سے کروٹیں بدلتے دیکھا تو سر جُوڑ کر بیٹھ گئے۔ آخر کار اُنھوں نے شہزادے کو بتایا کہ دُلہن کو ایک خاص قسم کے پرندے کی کلیجی کھلائی جائے تو اُس کا روگ دُور ہو جائے گا ورنہ بچنا مُشکل ہے۔ سب سے بڑے طبیب نے داڑھی کھجاتے ہوئے کہا:

''میں نے آج صُبح اس قسم کا پرندہ شاہی باغ میں اُڑتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''میرا خیال ہے، وہ پرندہ تو میرے پنجرے میں ہے۔'' یہ کہہ کر شہزادے نے ایک غُلام کو پنجرا لانے کے لیے کہا۔ غُلام پنجرا لے آیا تو سنہری چڑیا کو دیکھ کر نوکرانی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”ہاں، ہاں۔ یہی وہ پرندہ ہے۔“ بڑے ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔

”اس پرندے کا گوشت کھانے سے شہزادی کا روگ دُور ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر کمرے سے نِکل گئے۔

شہزادے نے غُلام سے کہا کہ سنہری چڑیا کو ذبح کر کے اِس کی کلیجی بھُون لاؤ۔ جب غُلام چڑیا کی کلیجی بھُون کر لایا تو شہزادے نے اپنے ہاتھوں سے دُلہن کو کھلائی۔ وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی، جیسے اُسے کوئی دکھ درد نہ تھا۔

جب چڑیا کو ذبح کر کے اُس کے پَر نوچے جا رہے تھے تو ایک پَر اُڑ کر دُور جا گِرا۔ اُس پر کِسی کی نظر نہ پڑی۔ باقی پَروں کو سمیٹ کر کوڑے کے ڈبّے میں ڈال دیا گیا۔ زندگی پھر پہلے کی طرح گزرنے لگی۔ شہزادے کو اب بھی اُمّید تھی کہ اُس کی دُلہن کی موہنی صُورت واپس آ جائے گی اور وہ پہلے کی سی حسین پری بن جائے گی۔ لیکن دُلہن تھا چہرہ مُہرہ تو کیا حسین ہوتا، عادتیں بھی خراب ہوتی گئیں۔ وہ بے حد مغرور اور نک چڑھی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن ایک بڑھیا کو، جو محل میں کام دھندا کرنے آتی تھی، سنہری چڑیا کا گِرا

ہوا پَر مل گیا۔ یہ بے حد خوب صورت تھا۔ بڑھیا نے اُسے اپنے گریبان میں اُڑس لیا اور گھر لے گئی۔ گھر لے جا کر اُس نے پَر کو دیوار میں گاڑ دیا تا کہ وہ چلتی پھرتی اُس نازک اور خوب صُورت پَر کو دیکھتی رہے۔

ایک دِن بُڑھیا محل میں کام کرنے گئی ہوئی تھی کہ ہوا کے جھونکے سے یہ پَر دیوار سے گِر گیا اور گِرتے ہی اُس خوب صورت پری میں بدل گیا جس کو شہزادہ درخت پر انتظار کرتا چھوڑ آیا تھا۔ پری چُپکے سے اُٹھی اور کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو ٹھیک کرنے لگی۔ پھر اُس نے کھانا پکایا۔ کھانا تیّار ہو گیا تو دستر خوان پر لگا کر دوبارہ پَر بن گئی اور دیوار کے سوراخ میں جا بیٹھی۔

شام کو بڑھیا تھکی ہاری گھر لوٹی تو سیدھی چولہے کے پاس گئی۔ وہ کھانا تیّار کرنا چاہتی تھی۔ دیگچی کا ڈھکنا اُٹھایا تو کھانا تیّار پڑا تھا۔ دستر خوان بِچھا ہوا تھا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ کمرا بھی صاف سُتھرا تھا۔ بڑھیا بڑی حیران ہوئی۔ ”یہ کام کس نے کیا ہے؟“ وہ سوچنے لگی۔

دوسرے روز بڑھیا کی حیرت میں اور اضافہ ہُوا۔ محل سے واپسی پر اُس نے دیکھا کہ کل کی طرح پھر ہر شے ٹھکانے پر رکھی ہوئی ہے۔ کھانا تیّار پڑا ہے۔ لیکن گھر میں کوئی نہیں۔

بڑھیا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچوں گی۔“

اگلی صُبح وہ روز کی طرح تیّار ہُوئی اور کمرے سے باہر نِکل گئی۔ لیکن محل کو جانے کے بجائے وہ باہر چھُپ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایک گھنٹا اِنتظار کرتی رہی لیکن کوئی نہیں آیا پھر اچانک اُسے اندر سے مدّھم مدّھم آوازیں آتی سُنائی دیں۔ اس نے کان دروازے پر رکھ دیا۔ ہاں ہاں۔ سچ مُچ کوئی کمرے میں چل پھر رہا تھا۔

بڑھیا نے ایک آنکھ دروازے کی درز پر رکھ دی اور دوسری آنکھ مِیچ کر اندر دیکھا۔ کمرے میں ایک نوجوان لڑکی، جس کا چہرہ چاند سے زیادہ حسین تھا، جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔

بڑھیا دروازہ کھول کر کمرے میں چلی گئی اور لڑکی سے پوچھا۔ ”بیٹی تُم کون ہو؟“

لڑکی نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، لیکن بڑھیا نے اُسے پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

”بیٹی، تُم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟“

لڑکی کو نوکرانی کا ظُلم یاد آگیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ بڑھیا نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور سر چُوم کر دوبارہ پُوچھا۔ اب لڑکی نے تمام کہانی کہہ سُنائی۔

جب بُڑھیا کو مکّار نوکرانی کی چالاکیوں کا پتا چلا تو اُس نے ارادہ کیا کہ وہ شہزادے کے سامنے یہ راز فاش کر دے گی تا کہ اُس کو اصل حقیقت کا علم ہو جائے۔ اس نے لڑکی کو حوصلہ دیا: ”نہ رو۔ نہ رو، میری بچّی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

بُڑھیا اُسی وقت محل میں گئی اور شہزادے سے کہا کہ میں آپ سے علیٰحدگی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ مہربانی کر کے میرے غریب خانے پر تشریف لے چلیے۔ شہزادے نے بڑھیا کی درخواست کو خُوشی سے منظور کر لیا۔

بُڑھیاشہزادے کولے کر گھر پُہنچی تورات کا کھاناتیّار تھا۔ دونوں نے مِل کر کھایا۔ اِس کے بعد کافی پی جانی تھی۔ اب کافی کے پیالے کون لے کر آئے اور پیالوں میں کافی کون بنائے؟ سنہری پری کے سوا یہ کام کون کر سکا تھا۔

جب شہزادے نے سنہری پری کو دیکھا تو لڑکھڑا گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے کمرا اُس کے گِرد گھُوم رہاہے۔ یاوہ خلامیں اُڑتا ہوا زمین پر گرنے ہی والا ہے۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" اُس نے بڑی مُشکل سے بُڑھیاسے پُوچھا۔

بُڑھیانے جواب دیا۔ "شہزادے صاحب، یہی آپ کی اصلی بیوی ہے۔" "لیکن یہ یہاں کیسے آگئی؟" شہزادے کی حیرت خُوشی میں بدل کر رہ تھی۔

بُڑھیا نے شہزادے کو نوکرانی کی چالاکی کی داستان حرف بہ حرف سُنا دی۔ شہزادے کو یوں لگا جیسے وہ خوشی سے دیوانہ ہو جائے گا۔ وہ اُسی وقت پری کو لے کر محل میں گیااور ماں باپ کو ساری کہانی سُنائی۔

محل میں شان دار جشن منایا گیاجو تین دن اور تین راتیں جاری رہا۔ مکّار نوکرانی

کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تا کہ وہ زندہ رہ کر اپنی مکّاریوں سے اوروں کو پریشان نہ کرے۔ شہزادہ اپنی سنہری پری کے ساتھ خُوشی خُوشی رہنے لگا۔

ناگ پری اور جادُو کا آئینہ

کسی زمانے میں کہیں ایک لکڑہارا رہتا تھا۔ جب وہ بُہت بوڑھا ہو گیا تو اس نے سوچا کہ اب مرنے کے دن قریب ہیں، بیٹے کو نصیحت کرنی چاہیے تاکہ وہ زندگی آرام سے گزارے۔ سو اس نے اپنے بیٹے کو بُلایا اور کہا:

"بیٹے، تمہیں معلوم ہے کہ جنگل کے فلاں کنارے پر دیو دار کا ایک درخت ہے جس کو میں نے آج تک نہیں چھیڑا۔ کل تم اکیلے لکڑیاں کاٹنے جاؤ گے کیوں کہ اب میرا آخری وقت آ چکا ہے۔ یاد رکھنا! تم بھی اس درخت کو کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ جنگل میں سے جو چاہے کاٹنا، مگر دیو دار کو کبھی نہ کاٹنا۔" یہ کہہ کر بُوڑھا لکڑہارا مر گیا۔

اس واقعے کو کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن لکڑہارے کا بیٹا جنگل میں گیا۔ اس نے دیو دار کے درخت کو غور سے دیکھا اور اپنے آپ سے کہا "کوئی ایسی خاص بات تو

نظر نہیں آتی اس درخت میں۔ آخر اسے کیوں نہ کالا جائے؟"

یہ کہا اور کلہاڑی اُٹھا کے درخت کے تنے پر مارنے لگا۔ درخت وہاں سے سِرک کر پرے ہٹ گیا۔ لکڑہارا ایک قدم آگے بڑھا تو درخت اور پیچھے ہٹ گیا۔ اب لکڑہارے نے درخت کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ درخت اس سے بھی تیز دوڑنے لگا۔ لکڑہارا تھک کر اُس جگہ واپس آ گیا جہاں سے چلا تھا اور کُلہاڑی کندھے پر رکھ، گدھے پر سوار ہو گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

چلتے چلتے رات ہو گئی۔ چاروں طرف اندھیرا گھُپ ہو گیا۔ لکڑہارے نے گدھے کو روکا اور وہیں رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ گدھے کو ایک درخت سے باندھا اور خُود اوپر چڑھ کر موٹی سی شاخ پر بیٹھ گیا۔

جیسے ہی دن نِکلا، لکڑہارا درخت سے نیچے اُترا۔ مگر واہ ری قسمت! جس جگہ رات کے وقت گدھا باندھا تھا وہاں گدھے کے بجائے ہڈّیوں کا ڈھیر پڑا تھا اور چند قدم کے فاصلے پر وہی دیودار کا درخت کھڑا تھا۔

لکڑہارے نے کُلہاڑی کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اچھّی بات ہے، میں پیدل ہی

اس کا پیچھا کروں گا۔"

دیودار کا درخت اور لکڑہارا آگے پیچھے چلتے ہوئے پہاڑوں پر سے گزرے، وادیوں اور میدانوں میں سے گزرے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دِن کا اُجالا سمٹنے لگا۔ یہ رات بھی لکڑہارے نے ایک درخت پر بسر کی اور اگلے دن پھر دیودار کے درخت کے پیچھے دوڑنے لگا۔

تیسرے دن ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا، جس سے لکڑہارا دیودار کے درخت کو بلکل بھُول گیا۔ اچانک اُس کے سامنے ایک ناگ اور ایک مست ہاتھی آ گئے۔ ناگ اور ہاتھی آپس میں لڑ رہے تھے۔ ناگ ہاتھی کو نگلنے لگا تھا، لیکن ہاتھی کے لمبے لمبے دانت رُکاوٹ بن گئے اور ہاتھی ناگ کے حلق میں پھنس گیا۔

لکڑہارے کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ حیرت سے بُت بنا کھڑا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اُس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ ہاتھی نے جب لکڑہارے کو دیکھا تو مدد کے لیے چلّایا "بچاؤ! بچاؤ! خدا کے لیے اس ناگ کو مار دو۔ جب تک جیوں گا تمہارا اِحسان مند رہوں گا۔"

”ذرا اس کے دانت تو کاٹ دو۔“ ناگ نے بھی لکڑہارے سے درخواست کی۔ ”میں تمھیں مالامال کر دوں گا۔“

بغیر کچھ سوچے سمجھے لکڑہارے نے کُلہاڑی اُٹھائی اور ہاتھی کے دانتوں پر ماری۔ دونوں دانت کٹ کر دُور جا گرے۔ ناگ نے پورے ہاتھی کو پیٹ میں اُتار لیا۔ اب ناگ نے بڑے اِطمینان سے لکڑہارے کی طرف دیکھا اور کہا:

”میں تمھیں اس کام کے بدلے میں بُہت سی دولت دوں گا۔“ یہ کہہ کر ناگ لکڑہارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

دونوں مزے مزے سے گپ شپ کرتے چلتے رہے۔ راستے میں ایک جھیل آ گئی۔ سانپ نے کہا:

”تم یہاں میرا انتظار کرو۔ میں ذرا نہا کر تازہ دم ہو لوں۔ اگر کوئی واقعہ پیش آئے تو ڈرنا مت۔ سمجھے؟“ یہ کہہ کر ناگ پانی میں کُود گیا۔ اسی لمحے زور کی آندھی چلنے لگی۔ چیختی چنگھاڑتی ہوا کے ساتھ بارش بھی ہونے لگی۔ بجلی اِس زور سے چمکتی تھی کہ لگتا تھا آسمان پھٹ جائے گا۔ کالے کالے بادل ایک دوسرے سے ٹکرا کر

ہولناک گرج پیدا کر رہے تھے۔ جب تک ناگ پانی میں نہاتا رہا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ جیسے ہی وہ پانی سے باہر آیا، طوفان تھم گیا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ ناگ نے لکڑہارے کو بتایا کہ نہا کر اُس کی تھکاوٹ دُور ہو گئی ہے۔ اب سفر آرام سے کٹے گا۔ دونوں پھر چلنے لگے۔ راستے کے دونوں طرف کاسنی کے بے شمار پھُول کھلے تھے۔ کبھی اُن کو توڑنے، کبھی ہنستے اور کبھی گاتے ناچتے۔ آخر اُنہیں ایک مکان دکھائی دیا۔ ناگ نے لکڑہارے کو بتایا:

"یہ میری ماں کا گھر ہے۔ ہم اسی گھر میں جا رہے ہیں۔ جب میری ماں کو پتا چلے گا کہ میرے بہترین دوست ہو تو وہ خوش ہو کر تمہیں مزے دار کھانا کھلانے گی۔"

لکڑہارے نے کہا "کچھ کھانے کو مل جائے تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔" ناگ نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "خبر دار! کچھ مت کھانا۔ بلکہ ماں سے کہنا کہ دیوار پر ٹنگا ہوا چھوٹا سا آئینہ دے دو۔"

باتیں کرتے کرتے وہ گھر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ ناگ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ناگ کی ماں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ بیٹے کا حال چال پُوچھنے کے بعد اُس نے

دریافت کیا کہ اُس کے ساتھ یہ اجنبی کون ہے؟ناگ نے جواب دیا:

”ماں جی، یہ میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ یہ میرا مُحسن ہے۔ اس نے میری جان بچائی ہے۔“

”تو بیٹا، اس کو اندر لے آؤنا۔ دودھ اور گوشت سے اس کی خاطر کرو۔“ماں نے کہا۔

لکڑہارا گھر کے اندر تو چلا گیا لیکن اُس نے کھانے سے انکار کر دیا، اور بہانہ یہ کیا کہ اُسے بھُوک نہیں ہے۔ ورنہ ضُرور کھاتا۔

”لیکن بیٹا، تم میرے بیٹے کے دوست ہو۔ میں تُمہیں کُچھ کھائے پیے بغیر کیسے جانے دوں۔ مجھے تو یہ بُرا لگ رہا ہے۔ اچھّا بیٹا، کچھ کھاتے نہیں تو کوئی تحفہ ہی لیتے جاؤ۔“ناگ کی ماں نے لکڑہارے سے کہا۔

لکڑہارے نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے پاس ایک چیز ہے۔ مجھے وہ مل جائے تو میرا سفر اچھّا کٹے گا۔“

ماں نے کہا۔ ”تم نام تو لو۔ میں فوراً دے دُوں گی۔“

لکڑہارا جلدی سے بولا۔ ”وہ جو سامنے دیوار پر آئینہ لٹک رہا ہے، وہ مجھے دے دیجیے۔“

ماں نے کہا۔ ”بڑی معمولی چیز مانگتے ہو۔ عجیب خواہش ہے تمہاری۔“

لکڑہارے نے جواب دیا۔ ”کیا خیر، یہ معمولی آئینہ ہی سفر میں میرے کام آئے۔“

”اچھا بیٹا۔“ ماں نے اتنا کہا اور آئینہ اُتار کر لکڑہارے کو دے دیا۔

ناگ اور ناگ کی ماں سے اجازت لے کر لکڑہارا پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے اُسے اچانک خیال آیا کہ ناگ نے اپنی ماں سے مُجھے آئینہ کیوں دلوایا؟ کُچھ تو اُس کا مقصد ہو گا نا آخر؟ یہ سوچ کر اُس نے جیب سے آئینہ نکالا۔ اُس کی پشت کو اچھّی طرح دیکھا۔ پھر اُلٹ کر سیدھا کیا اور اُس میں اپنی شکل دیکھنے لگا۔ لیکن آئینے میں اُسے اپنی شکل کے بجائے ایک دیو نظر آیا۔ اُس دیو نے بڑے ادب

سے جھک کر اُس سے کہا:

"کیا حکم ہے، شہزادے؟"

اس عجیب واقعے نے لکڑہارے کے ہوش اُڑادیے۔ وہ ایک منٹ تک بُت بنا کھڑا رہا۔ مارے حیرت کے اُس کے مُنہ سے بات نہ نکلی تھی۔ بُہت دیر بعد وہ سمجھا کہ دیو اُس سے حکم دینے کے لیے کہہ رہا ہے۔ اُس وقت لکڑہارے کو زور کی بھُوک لگی تھی۔

"مُجھے بھُوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو چاہیے۔"

مُنہ سے الفاظ کا نِکلنا تھا کہ لکڑہارے کے سامنے دستر خوان بچھ گیا، جس پر قسم قسم کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ دیو غائب ہو گیا۔ کھانا اِتنا لذیذ تھا کہ بے چارہ لکڑہارا اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"تو آئینے کا یہ مطلب ہے!" لکڑہارے نے دل ہی دل میں کہا۔ "یقیناً یہ جادُو کا آئینہ ہے۔" اس نے جیب سے پھر آئینہ نکالا اور اس میں جھانکا۔ دیو پھر حاضر ہو

گیا اور بولا:

"کیا حکم ہے، شہزادے؟"

اب بے چارے لکڑہارے کو کچھ سُوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا مانگے؟ اچانک اُس کو خیال آیا کہ اُس کی آؤ بھگت شہزادوں کی طرح ہو رہی ہے۔ شہزادے کے لیے محل بھی تو ہونا چاہیے۔ اس نے کڑک کر کہا:

"میرا محل کہاں ہے؟"

پلک جھپکتے میں وہ ایک عالی شان محل کے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ بادشاہوں کی طرح چلتا ہوا اور محل کی سجاوٹ دیکھتا ہوا اندر داخل ہوا۔ بڑے بڑے کمروں میں قیمتی قالین بچھے تھے۔ دروازوں پر بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ لکڑہارا آئینے کی کرامات دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

اس نے دل میں کہا۔ "اس محل میں رہنے کے لیے میرے ساتھ میری بیوی کا ہونا بھی تو ضروری ہے، اور یہ بیوی اگر بادشاہ کی بیٹی ہو تو واہ وا! آئینے سے شہزادی

مانگنی چاہیے۔"

یہ خیال آتے ہی لکڑہارے نے آئینے میں جھانکا۔ دیو نے حاضر ہو کر پُوچھا:

"کیا حکم ہے، سرکار؟"

لکڑہارے نے فوراً حکم دیا۔ "بادشاہ کی بیٹی حاضر کرو۔"

دوسرے ہی لمحے شہزادی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ لکڑہارا اُسے پا کر بے حد خوش ہوا اور اُس نے اُسی دن اُس سے شادی کر لی۔ شہزادی کے اس طرح اچانک غائب ہو جانے سے شاہی محل میں کُہرام مچ گیا۔ ملازموں نے محل کا کونا کونا چھان مارا مگر شہزادی کا کہیں نام نشان نہ ملا۔ آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ ملک بھر میں منادی کرا دی جائے کہ جو شخص شہزادی کو تلاش کرے گا، اُسے مُنہ مانگا انعام دیا جائے گا۔

شہزادی کے مِلنے کی اُمّید ختم ہو چکی تھی کہ ایک دن ایک بڑھیا محل میں آئی اور کہا کہ میں شہزادی کے بارے میں بادشاہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ بڑھیا کو فوراً بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

بڑھیا نے کہنا شروع کیا۔ "عالی جاہ، آپ کی سلطنت میں شہزادی کا کہیں سُراغ نہیں ملا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کِسی ایسے ملک میں چلی گئی ہے جو سات سمندر پار ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایسی جگہ ہو جس کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔"

بادشاہ نے بے چین ہو کر کہا۔ ”تمہاری کیا تجویز ہے؟“ ”عالی جاہ، پہلے تو آپ لکڑی کا ایک صندُوق بنانے کا حکم دیں۔ پھِر اس صندُوق پر جَست کی چادر منڈھوائیں۔ صندُوق اتنا بڑا ہو کہ میں اُس میں لیٹ اور بیٹھ سکوں، اور میرے ساتھ نو دن کی خوراک بھی رکھی جا سکے۔ جب میں اس میں بیٹھ جاؤں تو آپ اُس کا ڈھکنا مضبُوطی سے بند کر کے کھلے سمندر میں پھینک دینا۔“

بادشاہ کو جہاں بھی ذرا سی اُمّید نظر آتی، خُوش ہو جاتا۔ اس نے اسی وقت صندُوق تیّار کرنے کا حکم دیا۔ پھر بڑھیا کو صندُوق میں بٹھا کر نو دِن کی خوراک اس میں رکھ دی۔ اس کے بعد ڈھکنا اچھّی طرح بند کر کے صندُوق سمندر میں پھینک دیا گیا۔ سمندر کی موجیں جلد ہی صندُوق کو کھلے پانی میں لے گئیں۔

صندُوق دن رات پانی کی لہروں پر ڈوبتا بہتا رہا۔ آخر ایک دن صُبح کے وقت سمندر کے کنارے مچھیروں نے پانی میں جال پھینکا تو اُن کی نظر اُس صندُوق پر پڑی۔

یہ ساحِل اُس مُلک کا تھا جہاں کے لکڑہارے کا محل تھا۔ مچھیرے رسّوں کی مدد سے اُس بھاری صندُوق کو ساحِل تک کھینچ لائے۔ صندُوق کو کھول کر دیکھنے کا

شوق سب کو تھا۔ جلدی جلدی ڈھکنا اُٹھایا گیا۔ دیکھا تو اندر ایک بُڑھیا بیٹھی تھی۔

بڑھیا نے اپنے بارے میں بڑی دردناک کہانی سُنائی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے دو مکّار بیٹوں نے اُسے صندُوق میں بند کیا اور سمندر میں بہا دیا تا کہ بوڑھی ماں سے چھٹکارا پائیں۔ بڑھیا اپنی کہانی سناتی جاتی اور ساتھ ساتھ روتی بھی جاتی۔ مچھیروں کو بُڑھیا کے حال پر رحم آ گیا۔ بُڑھیا نے درخواست کی کہ وہ اُسے بادشاہ کے پاس لے جائیں۔ اگر وہ نیک دل ہے تو ضرور میری مدد کرے گا۔

مچھیرے بُڑھیا کو لکڑہارے کے محل میں لے گئے۔ وہاں جا کر اُس نے بادشاہ سے بات کرنے کی اجازت چاہی۔ لیکن اُس کو بادشاہ کے بجائے ملکہ کے پاس لے جایا گیا۔ یہ ملکہ وہی شہزادی تھی جس کی تلاش میں بُڑھیا وہاں تک پہنچی تھی۔ بڑھیا نے اُسے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا اور اُس کو بھی وہی دردناک کہانی سنائی جو مچھیروں کو سُنائی تھی۔ پھر اُس نے ملکہ سے درخواست کی کہ اُسے محل میں سر چھُپانے کی جگہ عنایت کر دی جائے۔ وہ اس کی خدمت کرے گی۔ ملکہ نے اپنے شوہر سے مشورہ کیا اور جب وہ راضی ہو گیا تو اُس نے بڑھیا کو اپنے پاس رکھ لیا۔

بڑھیا محل میں رہنے لگی۔

ایک مہینا گزر گیا۔ بڑھیا کو کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ محل کا کوئی نوکر بھی کام نہیں کرتا تھا۔ سب کام اپنے آپ ہو جاتے تھے۔ محل کا ہر حصّہ صاف ستھرا اور جگ مگ جگ مگ کر رہا ہوتا۔ کھانے کا وقت آتا تو لذیذ اور مزے دار کھانے آپ ہی آپ آتے۔

جب لکڑہارا گھر میں نہ ہوتا تو بڑھیا ملکہ کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتی۔ وہ ملکہ سے کرید کرید کر پوچھتی تھی کہ گھر کا کام کون کرتا ہے؟ بازار سے سودا سُلف لانے والا کون ہے؟ برتن کون صاف کر جاتا ہے، اور کھانا کون پکاتا ہے؟ بڑھیا کسی طرح لڑکی سے یہ راز اُگلوانا چاہتی تھی۔ لیکن ان باتوں کا علم ملکہ کو بھی نہ تھا۔ جادُو کے آئینے کی اُسے کوئی خبر نہ تھی۔ وہ جواب دیتی۔ ”میرا شوہر ان باتوں کے مُتعلّق جانتا ہے۔ میں نہیں جانتی۔“

بُڑھیا چالاکی سے کہتی۔ ”ملکۂ عالم، آپ اُن کی بیوی ہیں۔ وہ آپ کو نہیں بتاتے کہ گھر کا دھندا کون کرتا ہے اور باہر کا کام کس کے سپرد ہے؟ میں حیران ہوں کہ

آپ کیسی بیوی ہیں، اور شوہر کو آپ سے کیسی محبّت ہے جو وہ آپ سے یہ راز چھُپاتا ہے! یہ راز جاننا آپ کا حق ہے۔"

بُڑھیا ہر وقت اُسے اسی قسم کی پٹّی پڑھاتی رہتی۔ ملکہ تھی بھولی بھالی۔ وہ بُڑھیا کی باتوں میں آگئی اور بے چین سی رہنے لگی۔ ایک رات موقع پا کر اُس نے شوہر سے پُوچھا:

"کچھ مُجھے بھی تو معلوم ہو کہ محل کے اتنے سارے کام کون کرتا ہے۔ آپ اچھے شوہر ہیں کہ بیوی کو دل کی بات نہیں بتاتے۔"

لکڑہارے نے بیوی کی بات نہ ٹالی اور خُوشی خُوشی جادُو کے آئینے کے بارے میں بتا دیا۔ ملکہ نے آئینہ ہاتھ میں لے لیا۔ وہ دل بہلانے کے لیے اُس میں جھانکتی تو دیو حاضر ہو جاتا اور پُوچھتا:

"حکم، ملکۂ عالیہ؟" شہزادی دِل لگی کے لیے اُس کو اِدھر اُدھر دوڑاتی اور خوش ہوتی۔

اگلے دِن جب لکڑہارا روز کی طرح سیر و شکار پر چلا گیا اور بُڑھیا ملکہ کے پاس آ بیٹھی تو ملکہ نے اُسے جادُو کے آئینے کا سارا قصّہ کہہ سُنایا۔ بُڑھیا نے ہوشیاری سے یہ بھی پوچھ لیا کہ آئینہ کہاں اور کِس طرح اِستعمال کیا جاتا ہے۔ موقع پاتے ہی بُڑھیا نے جادُو کا آئینہ چُرا لیا اور دیو کو بُلا لیا۔ دیو نے حاضِر ہوتے ہی پوچھا:

"کیا حکم ہے، اے بزرگ خاتون؟"

بُڑھیا نے فوراً کہا۔ "مجھے اور شہزادی کو بادشاہ کے محل میں واپس پہنچا دو۔"

ایک لمحے میں دونوں بادشاہ کے محل میں تھیں۔ بُڑھیا نے آئینے کے دیو کو دوبارہ طلب کیا اور حکم دیا "جادُو کے محل کو راکھ کا ڈھیر کر دیا جائے۔"

اُسی لمحے لکڑہارے کا جادُو محل راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ لکڑہارا سیر و تفریح کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ دوپہر کو واپس آیا تو محل تھا نہ شہزادی۔ بس راکھ کا ایک ڈھیر تھا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اب کیا کرے! شہزادی نے باپ کے محل میں جانے سے پہلے کچّے گوشت کا ایک ٹکرا جادُو کے محل کی بلّی کے آگے ڈالا تھا۔ محل جلا تو بلّی کِسی طرح بچ نِکلی۔ اب وہ گوشت کا ٹکڑا ڈھونڈتی پھرتی تھی۔

لکڑہارا بھی بلّی کے ساتھ گوشت کا ٹکڑا ڈھونڈنے لگا۔ ٹکڑا جلد ہی مل گیا۔ لکڑہارے نے اُس ٹکڑے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصّہ بلّی کے آگے ڈال دیا اور دوسرا اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب یہی ٹکڑا شہزادی کی نشانی رہ گیا تھا۔ اُسے جیب میں ڈال کر وہ شہزادی کی تلاش میں نِکل کھڑا ہوا۔

وہ منزلوں پر منزلیں مارتا رہا۔ پہاڑ اور میدان ندی اور نالے، دریا اور سمندر اس کے ارادے کے سامنے کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ بس وہ چلتا رہا۔ آخر ایک دن اس ملک میں جا پہنچا جہاں کا بادشاہ شہزادی کا باپ تھا۔ لکڑہارا سیدھا شاہی محل میں داخل ہوا اور شاہی باورچی خانے میں ملازمت کی درخواست کی۔ اِتّفاق سے شاہی باورچی خانے میں برتن دھونے کے لیے مدد گار کی ضرورت تھی۔ لکڑہارے کا کام بن گیا۔ اب وہ کسی نہ کسی طرح شہزادی سے ملنے کے موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ وہ ہر وقت چوکنّا رہتا۔ یہ خبر اُسے مِل ہی چکی تھی کہ شہزادی محل میں واپس آگئی ہے۔

ایک روز اچانک شاہی باورچی خانے کا بُوڑھا باورچی بیمار ہو گیا۔ لکڑہارے نے اُس

سے کہا:

"بڑے میاں، آپ بس دیکھتے رہیں۔ میں سب کھانے تیّار کر کے ڈونگوں میں سجا دُوں گا۔"

بوڑھا باورچی رضامند ہو گیا۔ لکڑہارے نے شاہی باورچی کی ہدایت کے مطابق خوان سجائے اور شہزادی کی پلیٹ میں گوشت کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا بھی رکھ دیا جو وہ جادُو محل سے آتے ہوئے بلّی کو ڈال آئی تھی۔

شہزادی بھی اپنے شوہر سے جُدائی کی وجہ سے بُہت بے چین اور اُداس تھی اور ہر وقت سوچتی رہتی کہ شوہر کو کس طرح تلاش کرے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس سے ملنے کی اُمّید ختم ہوتی جارہی تھی۔ جب اُس نے اپنی پلیٹ میں وہی گوشت کا ٹکڑا دیکھا تو پہلے تو وہ پریشان ہُوئی پھر اُس کا دِل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ اُسے فوراً خیال آیا کہ اُس کا شوہر اِسی محل میں موجود ہے اور اب اُس سے مُلاقات مشکل نہیں۔

شہزادی نے باورچی کو بُلوایا اور اُس کے کھانے کی بُہت تعریف کی۔ پھر پوچھا کہ

کیا باورچی خانے میں کوئی نیا آدمی ملازم رکھا گیا ہے کیوں کہ کام پہلے سے بہتر ہونے لگا ہے۔ باورچی نے دست بستہ عرض کی:

”شہزادی صاحبہ، میں بوڑھا اور بیمار ہوں۔ آج مُجھ سے کام نہیں ہو رہا تھا، اس لیے میں نے اپنے نوجوان مددگار سے کھانا پکوایا۔ یہ نوجوان چند روز پہلے ہی ملازم رکھا گیا ہے۔ اچھا لڑکا ہے بے چارہ۔“

شہزادی نے کہا۔ ”بڑے میاں، آپ جائیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میری چائے اُسی نوجوان کے ہاتھ بھیج دینا۔“

جب میاں بیوی اتنی لمبی جدائی کے بعد دوبارہ مِلے تو اُن کی خُوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ شہزادی نے ایک ایک واقعہ شوہر کو سُنایا اور اُس نے بھی اپنا قصّہ تفصیل سے بیان کیا۔ اب دونوں نے مشورہ کیا کہ کِسی طرح جادُو کے آئینے کو حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ دوبارہ اپنے محل میں جا کر ہنسی خُوشی رہ سکیں۔

لیکن جادُو کا آئینہ تو اُس بُڑھیا کے قبضے میں تھا اور وہ ہر وقت محل میں شہزادی کے ساتھ رہتی تھی۔ بُڑھیا نے لکڑہارے کو دیکھتے ہی پہچان لیا کیوں کہ اب وُہی

شہزادی کا کھانا اور چائے لے کر آتا تھا۔

بُڑھیا نے آئینے کے دیو کو بُلایا اور حکم دیا کہ لکڑہارے کو اُس کے جلے ہوئے محل میں واپس پُہنچا دیا جائے۔ اگلے ہی لمحے لکڑہارا راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔ اب وہ تھا اور بوڑھی بلّی۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔

اب بلّی کی سُنیے۔ جب محل جل کر راکھ ہو گیا اور لکڑہارا بھی چلا گیا تو بلّی بھُوکوں مرنے لگی۔ مجبوراً چاہے پکڑ پکڑ کر کھانے لگی۔ جب لکڑہارا واپس واپس آیا تو حالات بِگڑ چُکے تھے۔ وہ اس طرح کہ چُوہوں کے بادشاہ کی فوج تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ایک ایک کر کے بلّی اُس کی فوج کے سارے سپاہی ہڑپ کر گئی تھی۔

جب چوہوں کے بادشاہ کو عِلم ہوا کہ انسانوں کا بادشاہ اپنی سلطنت میں واپس آ گیا ہے تو اُس نے سوچا کہ انصاف کے لیے بادشاہ کے پاس جانا چاہیے۔ وہ لکڑہارے کے پاس گیا اور چیں چیں کر کے بولا:

”خدا کے لیے میری مدد فرمایئے۔ اگر آپ کی بلّی اِسی طرح چھاپے مارتی رہی تو میں بالکل تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔“

لکڑہارے نے کہا۔ ”میں تو بِلّی کو یہاں سے ہٹا دوں گا، لیکن میرے دُکھ کو کون دُور کرے گا؟“

چوہے نے کہا۔ ”فرمایئے، آپ کو کیا دُکھ ہے؟ شاید میں آپ کے کسی کام آسکوں۔“

اس پر لکڑہارے نے الف سے یے تک تمام قصّہ کہہ سُنایا۔ جادُو کے آئینے کے بارے میں، شہزادی اور محل کے بارے میں۔ آخر میں اُس بُڑھیا کے بارے میں بھی بتایا جس کی مکّاری کی وجہ سے وہ اِس حال کو پُہنچا تھا۔

”اچھا! یہ بات ہے۔“ چُوہوں کے بادشاہ نے چیں چیں کر کے دُم ہلائی۔ ”آپ اپنی بِلّی سے میرے بچے کُھچے سپاہیوں کو بچالیں۔ میں اپنے سپاہیوں کو بھیج کر جادُو کا آئینہ منگوالُوں گا۔“

لکڑہارے سے مُلاقات کے بعد چُوہوں کے بادشاہ نے چوہوں کو بُلایا اور کہا کہ وہ چُوہے آگے آئیں جو بادشاہ کے محل میں اکثر جاتے رہتے ہیں۔ جب وہ چوہے آگے آئے تو اُس نے پوچھا کہ کون کون سا چُوہا بُڑھیا کو جانتا ہے؟“

ایک لنگڑا چُوہا آگے بڑھا اور بولا۔ ”حضُور، میں اس کُٹنی کے کمرے میں خوراک کی تلاش میں جاتا ہوں۔ جادُو کا آئینہ میں نے اکثر اُس کے ہاتھ میں دیکھا ہے۔ میں پتا چلاؤں گا کہ وہ آئینہ رکھتی کہاں ہے؟“

”تو تم کو ابھی وہاں جانے اور آئینے کا پتا لگانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ جیسے بن پڑے اُسے وہاں سے لے آؤ۔“

لنگڑے چوہے نے اپنے بادشاہ کے قدموں کی زمین کو چُوما اور کہا۔ ”عالی جاہ، آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن میرے ہمراہ کُچھ چُوہے بھیج دیے جائیں۔ وہ مُشکل وقت میں میری مدد کریں گے۔“

چوہوں کے بادشاہ نے اُس کی درخواست منظور کر لی۔

لنگڑا چُوہا ایک چوہے کی کمر پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ باقی چُوہے اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ سات سمندر پار بادشاہ کی سلطنت میں پہنچے۔ پہلے شاہی محل میں داخل ہوئے اور پھر بُڑھیا کے کمرے میں گھُس گئے۔

یہ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ مکّار عورت دستر خوان بچھائے، مزے سے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔ وہ خاموشی سے بُڑھیا کے سونے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ بُڑھیا کی ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ جلد ہی اُنہیں معلوم ہو گیا کہ آئینہ بُڑھیا کے تکیے کے نیچے رکھا ہے۔ بستر پر بیٹھنے سے پہلے بُڑھیا نے تقریباً سو بار آئینہ اُٹھا اُٹھا کر دیکھا۔ جب نیند نے بہت ستایا تو تکیے پر سر رکھتے ہی سو گئی اور خرّاٹے لینے لگی۔

بُڑھیا کے خرّاٹوں سے چُوہوں کو اُس کے سونے کا یقین ہو گیا تو تین چُوہے کُود کر بستر میں گھُس گئے۔ لنگڑے چُوہے نے اپنی دم بُڑھیا کی ناک میں گھُمائی۔

"آچھُو! آچھُو!" بُڑھیا کو چھینکیں آنے لگیں۔ دوسرے دو چُوہے جو اپنے کام میں بُہت تیز تھے، جلدی سے آگے بڑھے اور جوں ہی بُڑھیا نے چھینکنے کے لیے سر اُٹھایا اُنہوں نے تکیے کے نیچے سے جادُو کا آئینہ کھینچ لیا۔ چُوہے آئینہ لے کر اپنے بادشاہ کے پاس پہنچ گئے۔

چُوہوں کا بادشاہ بے حد خُوش ہوا اور اُس نے وعدے کے مطابق، لکڑہارے کو اُس کا آئینہ واپس کر دیا۔ لکڑہارے نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بِلّی کو بغل میں دبا کر چل پڑا۔ کُچھ دُور جا کر اُس نے آئینہ نکالا اور دیو کو طلب کیا۔ دیو نے آتے ہی سر جھُکا کر کہا: "کیا حکم ہے، میرے شہزادے؟"

لکڑہارے نے کہا۔ "میرے لیے پوشاک لاؤ۔ ایک شان دار گھوڑا اور فوج بھی حاضر کرو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ شاہانہ لباس پہنے اور بھاری فوج لیے بادشاہ کے شہر کی طرف

بڑھ رہا تھا۔

بادشاہ کو جب لکڑہارے کی شان و شوکت اور فوج کی خبر ملی تو اُس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر راضی ہو گیا۔ نوجوان لکڑہارے اور شہزادی کی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور ایک بہت بڑی ضیافت کا انتظام کیا گیا۔ پورے ملک میں چراغاں اور ہزاروں مہمانوں کو محل میں دعوت دی گئی۔

اب مکّار بُڑھیا کی سُنیے۔ لکڑہارے نے آئینے کے دیو کو بُلایا اور حکم دیا کہ بُڑھیا کو اس کے کرتوتوں کی سخت سزا دی جائے۔ بُڑھیا اُسی وقت محل سے غائب ہو گئی اور پھر کبھی نظر نہ آئی۔

سنہری بالوں والے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی شہر میں ایک لکڑہارا رہتا تھا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ وہ بُہت بُوڑھا تھا، اِس لیے کوئی دھندا نہیں کر سکتا تھا۔ اپنا اور تین بیٹیوں کا پیٹ کیسے پالتا۔۔۔ تینوں بہنیں کشیدہ کاری کر کے جو کچھ کماتیں اس سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ وہ سارا سارا دن اور آدھی رات تک سیتی پروتی اور پھُول کاڑھتی رہتی تھیں۔

ایک دن بادشاہ کی طرف سے حکم جاری ہُوا کہ تین راتیں شہر میں کوئی دیا بتّی نہ جلے۔ بادشاہ کو قتل کرنے کی سازش ناکام ہو گئی تھی۔ سازِش کا لیڈر مارا گیا تھا اور شہر میں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ جھٹپٹا جلد ہو جاتا تھا۔ بے چاری تینوں بہنیں بڑی مُصیبت میں تھیں۔ اندھیرے میں کڑھائی سلائی کیسے کرتیں۔ اور اگر کام نہ کرتیں تو اپنا

اور اپنے بُوڑھے باپ کا پیٹ کیسے پالتیں۔ آخر تینوں بہنوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا کام ہر حال میں جاری رکھیں گی۔

جب دِن کا اُجالا اندھیرے میں بدلنے لگا تو اُنہوں نے دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے اس طرح گرائے کہ روشنی کی ایک کِرن باہر نہ جاسکے۔ پھر بتّی جلا کر کام میں مصروف ہو گئیں۔

پہلی رات بغیر کِسی واقعے کے گُزر گئی۔ لیکن دوسری رات بادشاہ شہر کے دورے پر نکلا، یہ معلُوم کرنے کے لیے کہ رِعایا اس کے فرمان پر عمل کر رہی ہے یا نہیں۔

وہ شہر میں گھُوم پھر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ لکڑہارے کے مکان کے دروازے کی درزوں سے روشنی چھَن چھَن کر باہر آرہی ہے۔ وہ فوراً گھوڑے سے اُترا اور سیدھا دروازے پر گیا۔ لیکن جوں ہی اُس نے دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ اُس نے ہاتھ روک لیا اور کان لگا کر سُننے لگا۔

تینوں بہنیں کشیدہ کاری کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی کر رہی تھیں۔ اُن کا پسندیدہ موضوع وہی تھا جس پر اکثر لوگ باتیں کرتے ہیں، یعنی "کاش یُوں ہوتا!" اور "ذرا سوچو اگر۔۔۔"

لڑکیاں یہ گفتگو یہ سمجھ کر کر رہی تھیں کہ دوسرا کوئی نہیں سُن رہا۔ مگر دُوسرا کیا، مُلک کا بادشاہ سُن رہا تھا۔

بڑی بہن کہہ رہی تھی۔ "ذرا سوچو تو، محل میں رہنے والے کیسے مزے مزے کے کھانے کھاتے ہوں گے۔ اے کاش! اے کاش! میں بادشاہ کے باورچی کی بیوی ہوتی، تو کیسے مزے دار کھانے کھاتی۔"

یہ کہہ کر اُس نے چٹخارا لیا۔ "اور پھر میں بادشاہ سلامت کے لیے ایسا پھُول دار قالین تیّار کرتی کہ جو دیکھتا حیران رہ جاتا۔"

منجھلی بہن بولی۔ "اگر میں بادشاہ کے توشہ خانے کے افسر کی بیوی ہوتی تو بادشاہ کے شامیانے پر ایسی کشیدہ کاری کرتی جسے دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں چُندھیا جاتیں۔" یہ کہہ کر وہ مُسکرائی اور کام میں مصرُوف ہو گئی۔

بادشاہ دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس آگیا اور اس کی درز پر آنکھ رکھ کر اندر جھانکنے لگا۔ اب بڑی بہن نے چھوٹی بہن سے پوچھا:

”چھوٹی، تمہاری خواہش کیا ہے؟ تُم بھی تو کُچھ بولو۔“

چھوٹی شرما کر سُرخ ہو گئی۔ اُسے کُچھ جھجک سی محسُوس ہو رہی تھی۔ پھر اُس نے کشیدے کا کام ٹوکری میں رکھ دیا اور دُور خلا میں گھُورنے لگی۔ بادشاہ اُس وقت کھڑکی کے سوراخ سے اندر جھانک رہا تھا۔ اسے یُوں محسوس ہوا جیسے وہ اُسی کو گھور رہی ہے۔ بادشاہ نے اِس سے پہلے اتنا معصوم، اِتنا من موہنا اور بھولا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خواب دیکھتی، خیالوں میں ڈوبی، خوب صورت آنکھیں وہ زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اچانک لڑکی نے کہنا شروع کیا:

”میں اکثر سوچتی ہوں کہ کاش! میری شادی بادشاہ سے ہو جائے اور۔۔۔“

وہ کہتے کہتے رُک گئی، جیسے اپنے ہی الفاظ کی کھنک سے چونک گئی ہو۔

”چھوٹی بہنا، آگے بولو۔“ بڑی بہن نے حوصلہ دلایا تو وہ کہنے لگی: ”ہاں تو میں کہہ

رہی تھی، کاش! میری شادی بادشاہ سے ہو جائے اور ہمارے ہاں دو بچّے پیدا ہوں، دو سنہری بالوں والے پیارے پیارے بچّے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ان کے بال اس طرح چمکتے ہوں جیسے سورج کی کرنیں۔ جیسے چندا کی چاندنی۔ جیسے تارے کی لَو۔"

اِتنا کہہ کر چھوٹی بہن چُپ ہو گئی، اور تینوں بہنیں ٹھنڈی آہیں بھرتی کام میں مصروف ہو گئیں۔ ہر طرف خاموشی چھا چکی تھی۔

بادشاہ آرام کرنے کے لیے محل میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹ تو گیا مگر نیند کہاں۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گُزر گئی۔

دُوسرے دِن وہ صُبح سویرے اٹھا، بڑے وزیر کو بُلایا، اور حکم دیا کہ لکڑہارے کی تینوں بیٹیوں کو فوراً محل میں لایا جائے۔ اسی وقت حکم کی تعمیل کی گئی۔ بادشاہ نے بڑی بہن کی شادی اپنے بڑے باورچی سے اور منجھلی کی شادی توشہ خانے کے افسر سے کر دی۔ پھر سب سے چھوٹی کے ساتھ خُود نکاح کر کے اُسے اپنی ملکہ بنا لیا۔ محل میں اتنی خُوشیاں کبھی نہیں منائی گئیں جِتنی ان تین شادیوں پر منائی گئیں۔

یہ شادیاں ایک ساتھ ہوئیں۔ محل کی ایک کنیز ی خوشیاں دیکھ کر حسد کی آگ میں جل بھُن کر کوئلہ ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں دُعا مانگتی تھی کہ کسی طرح اِن تینوں کا محل سے پتّا کٹے۔

کنیز کی خواہش پوری ہونے میں دیر نہیں لگی۔ بڑی بہن جو بڑے باورچی کی بیوی تھی، مرغّن غذائیں کھا کھا کر پھُول کر کُپّا ہو گئی۔ موٹاپے نے اُسے کاہل اور آرام طلب بنا دیا۔ قالین تو کیا بُنتی، قالین بُننے کے خیال ہی سے اُسے جمائیاں آنے لگتیں۔ وہ بستر میں گھُستی اور مزے کی نیند سو جاتی۔ باورچی ایسی موٹی بھدّی بیوی سے تنگ آ گیا، جو کام کو تو ہاتھ نہ لگائے بس کھائے اور سو جائے۔ بادشاہ کو بھی غصّہ آنے لگا۔ اتنے مہینے گزر گئے اور وہ شان دار قالین بنایا ہی نہیں گیا جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب بڑی بہن کو اُسی جھونپڑی میں واپس بھیج دیا گیا جہاں سے وہ آئی تھی۔

محل کی کنیز خوشی سے جھُوم اُٹھی۔ جو کُچھ ہُوا تھا اُس کی مرضی کے مطابق ہُوا تھا، اور اب اُسے پکّی اُمّید تھی کہ باقی دونوں بہنیں بھی اسی طرح محل سے نکالی

جائیں گی۔

منجھلی بہن، جسے اچھے سے اچھا لباس پہننے کا بے حد شوق تھا، نت نئے کپڑے سِلوا کر پہنتی۔ صُبح سے شام تک کئی قیمتی پوشاکیں بدلتی۔ وہ سارا وقت آئینے کے سامنے بیٹھی رہتی۔ اُسے کام کرنے کی فرصت بھلا کہاں تھی۔ اس کا شوہر اور بادشاہ اس احمق لڑکی سے آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ایک دن ایسا شامیانہ تیّار کر دے گی جسے دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں چُندھیا جائیں۔ مگر وہ تو اتنی نازک مزاج ہو گئی تھی کہ شامیانے تیّار کرنا تو در کنار، ہاتھ میں سوئی پکڑتے درد ہوتا تھا۔ توشہ خانے کا افسری اپنی کاہل بیوی سے اُکتا گیا تھا۔ ایک روز بادشاہ نے شامیانے کا پوچھا تو وہ اور طیش میں آ گیا۔ سو بڑی بہن کی طرح منجھلی بھی بوریا بستر لپیٹ میکے چلی گئی۔

کنیز خوشی سے چھا گئی۔ اب وہ اِس بات کے اِنتظار میں تھی کہ چھوٹی بہن، جو ملکہ بنی بیٹھی ہے، کب محل سے نِکالی جاتی ہے۔ لیکن چھوٹی بہن نے بادشاہ کا دل جیت لیا تھا۔ اُس کے طور طریقے بہت اچھے تھے۔ بادشاہ کے دل میں اُس کے لیے بے

حد عزّت اور محبّت تھی۔ دونوں ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔

کنیز یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور حسد کی آگ میں جل رہی تھی۔ اسے ہر وقت یہی خیال ستاتا تھا کہ کسی طرح اس لکڑہاری کو محل سے نکلوا دیا جائے۔

جب محل میں یہ خبر پھیلی کہ ملکہ کے ہاں بچّہ ہونے والا ہے تو اس کمینی کنیز کا جلاپا اتنا بڑھ گیا کہ وہ اسے برداشت نہ کر سکی۔ دوڑی دوڑی بازار گئی اور کُتّے کے دو پلّے خرید لائی۔ خُدا کی شان ملکہ کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ ملکہ کی دیکھ بھال کے لیے بادشاہ نے اُسی کنیز کو مقرّر کیا تھا۔ کنیز نے موقع پا کر بچّوں کی جگہ کتّے کے پلّے رکھ دیے اور بادشاہ کو خبر کر دی کہ ملکہ نے انسان کے بچّوں کے بجائے کتّے کے بچّوں کو جنم دیا ہے۔

بادشاہ سیدھا ملکہ کے کمرے میں گیا۔ وہ بے چاری بے ہوشی کے عالم میں بستر پر پڑی تھی۔ پلنگ کے پاس جھُولے میں کتّے کے دو پلّے ٹیاؤں ٹیاؤں کر رہے تھے۔ بادشاہ غصّے سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے بال نوچ ڈالے، کپڑے پھاڑ دیے اور چیخ چیخ کر خُدا سے فریاد کرنے لگا کہ اے اللہ! تُو نے مُجھے کِس گناہ کی سزا دی

ہے؟

پھر اُس نے بے چاری ملکہ کو بستر سے گھسیٹ کر محل سے باہر نکال دیا اور حکم دیا کہ اس نابکار عورت کو سینے تک زمین میں گاڑ دیا جائے۔ غریب لکڑہارے کی بے بس بیٹی زمین میں گڑی رہی۔ جو بھی اُدھر سے گزرتا اس پر پتھّر برساتا۔ آخر ایک دن بھُوکی پیاسی مر گئی۔ اُس کو شہر سے دور ایک ویران جگہ پر دفن کر دیا گیا۔

اب بچّوں کا قصّہ سُنیے۔ ملکہ نے دو جُڑواں بچّوں کو جنم دیا تھا۔ ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ دونوں کے بال اس طرح چمکتے تھے جیسے سُورج کی کرنیں، جیسے چندا کی چاندنی، جیسے تارے کی لَو۔

مکّار کنیز نے اُن کی جگہ، پنگھوڑے میں پلّے تو رکھ دیے تھے، لیکن اب وہ اس فکر میں تھی کہ ان ننّھے مُنّے بچّوں کو کیوں کر ٹھکانے لگائے، وہ جلد سے ان سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ جب محل میں کُہرام مچا ہوا تھا اور بادشاہ غُصّے میں بال نوچتا اور کپڑے پھاڑتا اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا تو مکّار کنیز نے بچّے اُٹھائے اور شہر سے

بُہت دُور ایک ندی کے کنارے لے گئی۔ اس وقت تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ظالم نے بچّے ندی کے کنارے ڈال دیے تاکہ انہیں ہوا لگ جائے اور وہ مر کھپ جائیں۔

اِتّفاق سے، اس جگہ سے ذرا ہٹ کر، جنگل میں ایک کُٹیا تھی جس میں ایک بڑھیا اور بڈھا رہتے تھے۔ دونوں بے حد غریب اور بے اولاد تھے۔ اُن کے پاس ایک بکری کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ بکری کو ہری بھری چراگاہ میں چھوڑ دیتے جہاں وہ دن بھر چرتی رہتی۔ رات کو واپس آتی تو اُس کا دودھ دوہ کر پی لیتے۔

ایک روز بکری نے دودھ نہ دیا۔ اُنہوں نے سوچا بکری نے دودھ چڑھالیا ہے۔ کل سہی۔ بے چاروں نے پتّے کھا کر گزارہ کر لیا۔ اگلے دن شام کو بکری واپس آئی تو اُس کے تھن پھر خُشک تھے۔ اب انہیں فکر ہوئی۔ سوچا، ایک دن اور دیکھتے ہیں۔ اگلی شام پھر وہی حال۔ اب کیا کریں؟ تِین دن سے دودھ سے محرُوم تھے۔ اگلے دن بُوڑھے نے بُڑھیا سے کہا کہ آج میں بکری کو چرانے لے جاؤں گا اور چھُپ کر دیکھوں گا کہ اِس کا دودھ کون چُراتا ہے۔

بوڑھا بکری کے ساتھ گیا۔ وہاں اس نے جو منظر دیکھا، اس سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دوڑا دوڑا گیا کُٹیا میں آیا تاکہ بیوی کو بتائے۔ بُڑھیا نے پوچھا:

"کیا بات ہے؟ گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"میرے ساتھ آؤ۔ ابھی۔ جلدی سے میرے ساتھ چلو۔" بوڑھے نے ہانپتے ہوئے بڑی مُشکل سے کہا۔ بُڑھیا نے جلدی سے چادر اُوڑھی اور شوہر کے پیچھے پیچھے لُڑھکنے لگی۔ جب وہ ندی کنارے پُہنچے تو بُوڑھا مُنہ پر اُنگلی رکھے پنجوں کے بل چلنے لگا، اور بیوی کو اشارہ کیا کہ شور نہ کرے۔

ندی کنارے دو پیارے پیارے بچّے پڑے تھے۔ ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ اُن کے سر پر سنہری کِرنوں کے تاج تھے جن میں چاند ستارے چمک رہے تھے۔ اور بکری اُن کو اپنا دودھ پلا رہی تھی۔

بُڑھیا حیرت سے چیخی۔ "ہائے! کتنے پیارے ہیں۔" دونوں بڑھیا بُڈھے دبے پاؤں بچّوں کے قریب گئے۔ بوڑھے نے لڑکی کو اُٹھا لیا اور بُڑھیا نے لڑکے کو۔ اور دونوں کُٹیا میں واپس آ گئے۔ وہ بہُت ہی خُوش تھے۔ اُنہیں یُوں لگ رہا تھا

جیسے خُدا نے اُن کے گھر میں دو ننّھے ننّھے فرشتے اُتار دیے ہیں اور اُنہیں اُن کی دیکھ بھال اور پرورش کا ذمّہ دار بنایا ہے۔

اِس طرح یہ سنہری بالوں والے بہن بھائی بُڑھیا بُڈھے کے پاس رہنے لگے۔ میاں بیوی ان بچّوں پر جان چھڑکتے تھے اور اپنے بچّوں کی طرح اُنہیں پال پوس رہے تھے۔ جب لڑکا خوب بڑا ہو گیا اور لڑکی بھی جوان ہو گئ تو وہ بھی اُن کی خدمت اُسی محبّت اور لگن سے کرنے لگے، کیوں کہ وہ اُنہی کو اپنے والدین سمجھتے تھے۔ لڑکا شکار کھیلتا، کھیتی باڑی کرتا اور لڑکی گھر کے کام کرتی۔ بوڑھے میاں بیوی سُکھ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن اس دنیا میں کوئی بھی ہمیشہ نہیں رہتا۔ ایک ایک کر کے بُوڑھے اور بُڑھیا کو بھی اللہ کے گھر سے بُلاوا آ گیا اور وہ ایک روز سنہری بالوں والا نوجوان جنگل میں شکار کھیل رہا تھا کہ اُسے شاہی محل سے آنے والے شکاری ملے۔ ان میں بادشاہ بھی تھا۔ بادشاہ کی نظر اُس نوجوان پر پڑی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس سے پہلے اس نے اتنا خُوب صُورت نوجوان کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک اس غم پر قابو نہ پا سکتا تھا جو اس کو اپنی پیاری بیوی کی موت سے

ہوا تھا۔ اُس نے سوچا ”کاش! یہ نوجوان اس کا بیٹا ہوتا۔“

بادشاہ نے اپنے وزیر کو بُلایا اور حکم دیا کہ پتا لگایا جائے کہ یہ نوجوان کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ وزیر سنہری بالوں والے نوجوان کے پاس پہنچا اور اس کا حال احوال پُوچھا۔

سنہری بالوں والا نوجوان بے چین سا ہو گیا۔ بھلا ان شان و شوکت والے لوگوں کا اس سے کیا کام۔ اس نے جواب دیا:

”یہ جنگل میرا گھر ہے، اور روزی سب کو خُدا دیتا ہے۔“ اِتنا کہہ کر اُس نے اپنی راہ لی۔ وزیر فوراً بادشاہ کے پاس پُہنچا اور اِطّلاع دی کہ نوجوان نے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا کہ: ”یہ جنگل میرا گھر ہے، اور روزی سب کو خدا دیتا ہے۔“

اب بادشاہ جب بھی اس خُوش شکل نوجوان کے بارے میں سوچتا، اس کا دل بھر آتا۔ اس کے سنہری بال بادشاہ کی نگاہوں میں ہر وقت سے بسے رہتے۔ اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، ایک ہی خیال ذہن پر چھایا رہتا۔۔۔۔ کاش! یہ نوجوان اس کا بیٹا ہوتا۔

سنہری بالوں والے نوجوان کی خبر اُڑتی اُڑتی مکّار کنیز کے کانوں تک بھی پُہنچی۔ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ سوچا، ہو تو یہ ان بچوں میں سے کسی کی روح ہے، جنہیں وہ مرنے کے لیے ندی کنارے چھوڑ آئی تھی۔ یہ روح اُسے ڈرا ڈرا کر مارنے آئی ہے۔ وہ فوراً ندی کنارے پُہنچی اور اِدھر اُدھر گھُومنے لگی۔ اُس کے دل میں شُبہ پیدا ہونے لگا کہ مُمکن ہے سنہری بالوں والا نوجوان روح نہیں سچ مُچ کا انسان ہو اور ان جُڑواں بہن بھائی میں سے ایک ہو۔ ممکن ہے دونوں بہن بھائی زندہ ہوں اور یہیں کہیں رہتے ہوں۔

جنگل میں گھومتے گھومتے وہ کُٹیا تک جا پہنچی اور دروازے میں سے اندر جھانکا۔ لڑکی کو دیکھ کر اُس کا دِل زور سے دھڑکنے لگا کیوں کہ لڑکی کے سر پر سنہری کرنوں کا تاج تھا، اس میں چاند ستارے چمک رہے تھے اور ان کی روشنی سے کُٹیا میں اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ لڑکی نے اچانک سر اُٹھا کر دیکھا تو پتا چلا کہ باہر کوئی عورت کھڑی ہے۔ اس نے بڑے اخلاق سے کہا:

"اندر تشریف لے آیئے۔"

مکّار عورت مُسکراتی ہوئی اندر آ گئی اور لڑکی کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ پھر بناوٹی پریشان سے پوچھا:

"بیٹی، کیا تُم یہاں تنہا رہتی ہو؟"

"نہیں تو۔" لڑکی نے جواب دیا "میرے بھیّا بھی ہیں۔ وہ جنگل میں شکار کے لیے گئے ہیں؟"

عورت نے کہا۔ "بیٹی، اکیلی تو تُم اُداس ہو جاتی ہو گی؟"

"لیکن کروں کیا؟ مجبوری ہے۔" لڑکی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے بھیّا کو شکار پر تو جانا ہی ہے۔ نہ جائیں تو ہم کھائیں گے کیا؟ پھر گھر کا کام بھی بُہت ہوتا ہے۔ میں اس میں لگی رہتی ہُوں۔"

کنیز نے لڑکی کو پیار کیا اور چلی گئی۔ جب وہ جنگل سے لوٹ رہی تھی تو غصّے سے کانپ رہی تھی۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ کسی مُعجزے سے سنہری بالوں والے بہن بھائی زندہ بچ گئے ہیں اور اب جوان ہو کر اُس کے لیے خطرے کا باعث بننے

والے ہیں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اُن کے زندہ رہنے سے اُس کو سکون نہیں مل سکتا۔ محل کو واپس جاتے ہوئے اُس کے خیالات بُری طرح بھٹک رہے تھے۔ وہ سنہری بالوں والے بہن بھائی کو دنیا کے تختے سے مٹا دینا چاہتی تھی۔ اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مُعاملے میں بُوڑھی کُٹنی سے مشورہ کرے گی۔ یہ کُٹنی جادُو منتر کے فن میں دُور دُور تک مشہور تھی۔

دُوسرے دِن مکّار کنیز بُوڑھی کٹنی سے مشورہ کر کے جنگل کی طرف روانہ ہوئی۔ کُٹنی نے اُسے بہن بھائی کو ٹھکانے لگانے کی ترکیب بتا دی تھی۔ وہ اُسی جھونپڑی میں پہنچی جہاں سنہری بالوں والے بہن بھائی رہتے تھے۔ لڑکی کی روز کی طرح آج بھی اکیلی تھی۔ عورت کو دیکھ کر اُس نے ادب سے سلام کیا۔ ”جیتی رہو، میری بچی“ عورت نے جواب دیا۔ ”خُدا بُری نظر سے بچائے۔ تمہاری تنہائی کا سوچ کر میرا دل بے حد اُداس ہُوا، اس لیے چلی آئی کہ کچھ دیر اپنی بیٹی کے پاس بیٹھوں گی پر مجھے معلوم ہے کہ مُجھ جیسی بُڑھیا کے پاس بیٹھ کر تُمھیں خُوشی نہیں ہو گی۔“

”نہیں نہیں۔“ لڑکی نے جلدی سے کہا۔ ”آپ کی مہربانی ہے کہ آپ تشریف لائیں۔ مجھے تو آپ کو دیکھ کر بُہت خُوشی ہوئی ہے۔“

”دیکھا، بیٹی۔“ عورت نے کہا۔ ”تُم تنہائی کو محسوس تو کرتی ہو مگر مُنہ سے کہنا نہیں چاہتیں۔ ہے نا؟“

”ایسا ہی ہو گا۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”مجھے تنہائی کا احساس ہوتا ہے، اور کبھی کبھی کوئی چھوٹی موٹی تفریح کو بھی جی چاہتا ہے۔“

عورت بولی۔ ”میری بات غور سے سُنو اور جو کہوں وہی کرو۔ پھر دیکھنا، کیا ہوتا ہے۔“

لڑکی کا شوق بڑھ گیا اور وہ کھسک کر عورت کے قریب بیٹھ گئی۔ عورت نے کہنا شروع کیا:

”آج شام جب تمہارا بھائی شکار سے لوٹے تو تُم آنسو بہانے لگنا۔ جب وہ پُوچھے کہ معاملہ کیا ہے تو ہچکیاں لے لے کر رونے لگنا اور اُسے یہ اِحساس دِلانا کہ تم غم کی

وجہ سے بات بھی نہیں کر سکتیں۔ جب وہ پُوچھ پُوچھ کر تنگ آ جائے تو کہنا کہ میں سارا دِن کُٹیا میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ میرا دل نہیں لگتا۔ اور جب وہ کہے کہ پیاری بہن، میں کیا کر سکتا ہوں جس سے تُم خُوش ہو جاؤ، تو کہنا بھیا، مجھے پریوں کی ملک کے باغ کے درخت کی ایک ٹہنی لا دو۔ میں خوش ہو جاؤں گی۔"

"آپ نے جو کہا میں اسی طرح کروں گی۔" لڑکی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ اور کنیز مُطمئن ہو کر چلی گئی۔

شام کو سنہری بالوں والا نوجوان گھر لوٹا تو دیکھا کہ بہن اِستقبال کرنے کے بجائے کونے میں دبکی زور زور سے رو رہی ہے۔ بھائی کو ایسے لگا جیسے بہن کی سسکیوں سے اُس کا دل پھٹ جائے گا۔ اُس نے شکار کا تھیلا ایک طرف رکھا اور بہن کو پیار کرتے ہوئے پوچھا:

"مجھے بتاؤ میری پیاری بہنا، تمہیں کیا دُکھ ہے؟ کیا تُم بیمار ہو؟"

لڑکی نے کہا "نہیں بھیا، میں بیمار نہیں ہوں۔ لیکن مجھے دُکھ ہے۔"

"کیا دُکھ ہے؟" بھائی نے پوچھا۔ وہ سخت پریشان تھا۔

"میں سچ مُچ دُکھی ہوں، بھیّا۔" لڑکی نے ہچکیاں لیتے ہُوئے کہا "اور میرا دُکھ تنہائی ہے اور کچھ نہیں۔"

"تم جانتی ہو، مجھے پیٹ کی خاطر شکار پر جانا پڑتا ہے۔" بھائی نے نرمی سے کہا۔ "لیکن میں اپنی پیاری بہن کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، کروں گا۔ تم صِرف بتادو۔"

"مجھے پریوں کی ملکہ کے باغ کے درخت کی ایک ٹہنی لادو۔"

"پھر تُم خُوش ہو جاؤ گی؟" بھائی نے محبّت سے بہن کے ہلکی سی چپت لگائی۔

"ہاں۔" بہن نے جواب دیا۔

اگلے دِن نوجوان بُہت سویرے اُٹھا اور پرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ پریوں کی سلطنت کی سرحد تک پہنچنے میں اُسے کئی دن لگ گئے۔ اس کو اتنی مُشکلات پیش آئیں کہ دنیا میں شاید ہی کسی کو پیش آئی ہوں۔ وہ ایک لق و دق ریگستان سے

گزرا۔ وہ ایسے ایسے پہاڑوں کو عبور کر گیا جن پر پرندے پَر نہیں مار سکتے تھے۔ ایسی وادیاں اس کی راہ میں آئیں جہاں کوئی چراگاہ نہ تھی۔ لیکن وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں ایک ہی دُھن سمائی ہوئی تھی کہ کِسی نہ کِسی طریقے سے اپنی بہن کو خُوش کر دے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو خُشک کر دے۔

جب وہ ایک پہاڑ کی ڈھلان پر سے گُزر رہا تھا اور راستے پر نظر جمائے ہوئے تھا تو اچانک ایک عالی شان محل نظر آیا۔ اس محل میں پریوں کے محلوں جیسی چمک دمک نہ تھی، بلکہ ایک اداس اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ یہ اصل میں جنّات کا مُلک تھا اور جنوں کی ملکہ پُوچھ گُچھ کے لیے نوجوان کی طرف آ رہی تھی۔

بہادر نوجوان خوف زدہ نہیں ہوا۔ اُس نے مُسکرا کر جِنوں کی ملکہ کا اِستقبال کیا اور جھُک کر ادب سے سلام کیا۔

"جیتے رہو، میرے بچّے۔" جنّات کی ملکہ نے جواب دیا اور پھر پوچھا۔ "تم اِدھر کیسے آ نکلے؟" "میں پریوں کی ملکہ کے باغ کے درخت کی ایک ٹہنی کی تلاش میں آیا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

”میرے بچّے، اگر تم میرے ساتھ اتنے اچھے طریقے سے پیش نہ آتے تو میں ابھی تُمہارا ایک لُقمہ بناتی اور نِگل جاتی۔ لیکن تم نے محبّت سے میرا دل جیت لیا، اور میں نے فیصلہ کیا کہ تُم دنیا میں زندہ رہو۔ لیکن پریوں کی ملکہ کے باغ تک پہنچو گئے کیسے؟ سمجھ لو، آگے بڑھنا موت کے مُنہ میں جانا ہے۔“

”آپ مدد کریں تو میری مشکل آسان ہو سکتی ہے۔“ نوجوان نے بڑی تمیز کے ساتھ کہا۔

”مگر میرے بچّے، پریوں کی ملکہ کے باغ میں جادُو کا پہرا ہے اور کئی انسان وہاں اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔“ جنّات کی ملکہ نے نوجوان کو خبر دار کیا۔

لیکن نوجوان کا ارادہ پکّا تھا۔ وہ اپنی بہن کو خوش کرنے کے لیے کِسی بھی مُشکل سے ٹکرا سکتا تھا۔ مَوت کا ڈر اُس کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

”میں ضرور جاؤں گا۔“ نوجوان نے زور سے کہا ”آپ مُجھے راستہ بتایئے۔“
نوجوان کا حوصلہ اور پکّا اِرادہ دیکھ کر جنّات کی ملکہ ایک پتھّر پر بیٹھ گئی اور نوجوان کو بھی پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اچھا بیٹا، تُمھیں اپنا سفر صُبح سویرے شروع کرنا چاہیئے۔ ناک کی سیدھ چلتے رہنا۔ آگے ایک جنگل آئے گا۔ وہاں پہنچ کر سات پرندے پکڑنا۔ اسی جنگل کے درمیان میں ایک کنواں مِلے گا۔ پرندوں کو کنویں پر لے جانا اور دو نفل نماز پڑھنا۔ پھر پرندوں کو کنویں میں ڈال دینا اور زور زور سے کہنا:

"چابی لینے آیا ہُوں۔ چابی لینے آیا ہُوں۔"

چابی کنویں میں سے باہر پھینک دی جائے گی۔ چابی لے کر دوبارہ سفر شروع کر دینا۔ چلتے چلتے راستے میں ایک بُہت بڑا غار آئے گا۔ اس کا دروازہ بند ہو گا۔ اس چابی سے غار کا دروازہ کھولنا۔ جب تُم دروازے کو دھکیلو تو دایاں ہاتھ پھیلا کر جو چیز سامنے پڑی ہو، اُسے مضبوطی سے پکڑ لینا اور اپنی طرف کھینچنا۔ پھر دروازہ بند کر کے تالا لگانا اور واپس کنویں پر آ جانا۔ چابی کنویں میں پھینک دینا اور پیچھے دیکھے بغیر جلدی سے چلنا شروع کر دینا۔ اگر تُم نے پیچھے مُڑ کر دیکھ لیا تو پھر خُدا ہی تُمہارا حافظ ہے۔"

اگلے دِن سُورج نکلنے سے پہلے نوجوان اپنے سفر پر رواز ہو گیا اور جنّات کی ملکہ نے

جو کچھ بتایا تھا، اُسی طرح کرتا رہا۔ جنگل میں پُہنچا۔ پرندے پکڑے۔ کنویں میں ڈالے۔ پانی لیا۔ غار کا دروازہ کھولا۔ وہ چیز پکڑی۔ بھلا وہ چیز کیا تھی؟ یہی تو پریوں کی ملکہ کے باغ کے درخت کی ٹہنی تھی۔ یہ ایسی خوب صورت چیز تھی کہ انسان اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ٹہنی چھوٹی چھوٹی شاخوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہر شاخ پتّوں سے بھری ہوئی تھی اور ہر پتّے کے اوپر ایک پیارا سا پرندہ بیٹھا تھا۔ ہر پرندے کے گلے میں سُریلی راگنی تھی۔ ایسی میٹھی راگنی کہ مُردے سُنیں تو جی اُٹھیں۔

نوجوان ٹہنی لے کر خُوشی سے جھُومتا، جلدی جلدی، گھر کی طرف روانہ ہُوا۔ اس نے پیچھے مُڑ کر بالکل نہیں دیکھا۔ گھر پُہنچ کر ٹہنی اپنی بہن کو پیش کی۔

سنہری بالوں والی لڑکی ٹہنی لے کر خُوشی سے مُسکرائی۔ ٹہنی پر بیٹھے پرندوں کے سُریلے نغموں سے کُٹیا میں رونق آ گئی۔ ہر طرف موسیقی بکھر گئی۔ بہن کو ہنستے بولتے دیکھ کر بھائی خوش ہو گیا اور شکار کھیلنے جنگل میں چلا گیا۔

وہ ہاتھ میں کمان سے جنگل میں شکار تلاش کر رہا تھا کہ بادشاہ بھی شکار کھیلتا ہوا

اُدھر آ نِکلا اور نوجوان کو دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن نوجوان اپنی دُھن میں چلا جا رہا تھا۔ اُس نے بادشاہ کی پرواتک نہ کی۔

بادشاہ محل میں واپس آیا تو اُس کا دل بُہت اُداس تھا۔ کاش! یہ سنہری بالوں والا نوجوان اُس کا اپنا بیٹا ہوتا۔

محل کی مکّار کنیز پھر سنہری بالوں والی لڑکی سے ملنے جنگل میں گئی۔ کُٹیا میں پُہنچ کر اُس نے دیکھا کہ سنہری بالوں والی لڑکی خُوش خُوش پھر رہی ہے اور کُٹیا میں پرندوں کے نغمے بکھرے ہوئے ہیں تو اُس کو بُہت غصّہ آیا۔ اُس نے مکّاری سے مُسکرا کر لڑکی کو دُعائیں دیں، پیار کیا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ لڑکی کو ہنستا مُسکراتا دیکھ کر بُہت ہی خُوش ہوئی ہے۔

"دیکھا۔ میں نے کتنی اچھی نصیحت کی تھی تمہیں؟"

"ہاں، ماں جی۔ آپ نے سچ کہا تھا۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"لیکن اگر تم پریوں کا آئینہ دیکھ لو تو۔۔۔" کنیز نے آہستہ سے کہا۔

"ہائے۔۔۔!" لڑکی کے مُنہ سے صِرف اِتنا نِکلا۔

"اگر تُمہیں یہ آئینہ مل جائے تو تُم اِس ٹہنی کی پروا بھی نہ کرو۔۔۔ بیٹی، میری مانو۔ بھائی کو اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھنے دو جب تک وہ تُمہیں پریوں کی ملکہ کا آئینہ نہ لا دے۔"

شام کو بھائی واپس آیا تو بہن زار و قطار رو رہی تھی۔ ہچکیاں تھیں کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ یُوں لگتا تھا کہ چیخ چیخ کر اُس کا کلیجا پھٹ جائے گا۔

بھائی نے پوچھا۔ "میری اچھّی بہن، اب کیا ہُوا؟ میں تُمہیں خُوش کرنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیّار ہُوں۔ بس تُم مُجھے بتا دو۔"

بہن نے سُسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بھیّا۔۔۔ بھیّا۔ میرا دل اُس وقت تک خُوش نہیں ہو گا جب تک میرے پاس پریوں کا آئینہ نہ ہو۔" دوسرے دِن بھائی صُبح ہی صُبح آئینے کی تلاش میں نِکل کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے جنّات کے ملک میں پُہنچا۔ وہ جنّات کی ملکہ سے ایک دفعہ پھر مدد لینا چاہتا تھا۔

جنّات کی ملکہ نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "مُجھے لگتا ہے تُم اپنے آپ کو برباد کر کے رہو گے۔ پریوں کی ملکہ کا آئینہ تو پریوں کے محل ہی میں ہو گا، اور محل میں داخل ہونا پریوں کے باغ میں جانے سے بھی زیادہ مُشکل ہے۔"

"ماں جی، آپ مجھے راستہ بتا دیں۔" نوجوان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ مُجھے پتا بتا دیں۔ میں خُود چلا جاؤں گا۔"

"اچھا۔۔۔" ملکہ نے کہنا شروع کیا۔ "پہلے تو یہ لوہے کے جُوتے پہن لو۔ اور لو یہ لوہے کا لٹھ۔ اس کو ہاتھ میں پکڑ لو۔ یہاں سے مشرق کی طرف چلتے جاؤ۔ چلتے چلتے تُمہارے سامنے دو دروازے آئیں گے۔ ان میں سے ایک دروازہ بند ہو گا اور دوسرا کھلا۔ کھُلے دروازے کو بند کر دینا اور بند دروازے کو کھُول کر اُس کے اندر چلے جانا۔ آگے جا کر ایک اور دروازہ نظر آئے گا۔ اس دروازے پر ایک شیر اور بکری کا پہرا ہو گا۔ شیر کے سامنے گھاس پڑی ہو گی اور بکری کے آگے گوشت۔ اگر شیر کے سامنے گوشت اور بکری کے سامنے گھاس ڈال دو تو یہ حیوان تُمھیں دروازے سے گُزر جانے دیں گئے۔"

"اب چلتے چلتے تُمہارے راستے میں تیسرا دروازہ آئے گا، جس کے سامنے دو جگہ آگ کی بھٹّیاں ہوں گی۔ ایک بھٹّی میں سے خُوب شُعلے اُٹھ رہے ہوں گئے، دوسری بجھتی ہوئی چنگاریوں کا ڈھیر ہو گا۔ تُم جلتی ہوئی آگ کو بُجھا دنیا اور بجھتی ہوئی آگ کو جلا دینا۔ اس طرح آسانی سے اس دروازے سے بھی گُزر جاؤ گے۔ یہ دروازہ تُمہیں پریوں کے باغ میں لے جائے گا۔ اس باغ کو جلدی جلدی پار کرنا اور یہ پری محل میں داخل ہو جانا۔ یہاں ملکہ کی خواب گاہ میں تُمہیں آئینہ ملے گا۔ اُسے جلدی سے اُٹھانا اور بھاگ آنا۔ لیکن یاد رہے، پیچھے مُڑ کر ہرگز نہ دیکھنا۔"

نوجوان پھر مُہم پر روانہ ہو گیا۔ جنّات کی ملکہ نے جیسا بتایا تھا، ویسا ہی کرتا گیا۔ تمام واقعات اُسی طرح پیش آئے۔ وہ محل میں داخل ہوا، اور جادُو کا آئینہ تلاش کیا۔ آئینہ لے کر بھاگنے ہی والا تھا کہ اُس کے پاؤں کے نیچے زمین کانپنے لگی اور گرج دار آواز آئی:

"اے آگ کی بھٹّی! اس چور کو روک لے اور جلا کر بھسم کر دے۔"

"نہیں۔۔۔ ہم نہیں کر سکتے۔" دونوں بھٹّیوں میں سے ایک ساتھ آوازیں آئیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ "اس لڑکے نے مُجھے بُجھا دیا تھا۔"

دوسری بولی۔ "اس نے مجھے جلا دیا تھا۔"

اس عرصے میں نوجوان بھاگتا ہوا اُس دروازے تک پہنچ گیا جہاں شیر اور بکری بندھے ہوئے تھے۔ یہاں پھر وہی گرج گُونجی:

"اے شیر !اس چور کو پکڑ کر نِگل جا۔"

"نہیں۔ ہر گز نہیں۔" شیر نے جواب دیا۔ "اس لڑکے نے تو مُجھے گوشت کھلایا ہے۔ اب میرا پیٹ خُوب بھر گیا ہے۔"

شیر یہ کہہ ہی رہا تھا کہ نوجوان دوڑتا ہُوا دروازے سے گُزر گیا۔ بکری نے بھی اُسے کچھ نہیں کہا۔ وہ گھاس کھاتی رہی۔ جب وہ دو بڑے دروازوں پر پہنچا تو پھر وہی گرج دار آواز آئی:

"اے کھلے دروازے! اس چور کو گُزرنے مت دے۔"

دروازہ ہنس کر بولا۔ "ہاہا! اگر یہ نوجوان نہ ہوتا تو میں ابھی تک بند پڑا ہوتا۔ ہاہا"!

نوجوان یہاں سے بھی گُزر گیا اور کسی مُشکل میں پھنسے بغیر اپنی بہن کے پاس پہنچ گیا۔ سنہری بالوں والی لڑکی یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوئی کہ اُس کا بہادر بھائی اُس کے لیے پریوں کی ملکہ کا آئینہ لے آیا ہے۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ جادُو کے اِس آئینے میں کیا نظر آتا ہے۔ وہ لڑکی اس میں نہ صرف اپنا چہرہ دیکھ سکتی تھی بلکہ اس میں تمام دنیا نظر آتی تھی۔

دوسرے دِن نوجوان، اپنی بہن کو خوش دیکھ کر، شکار کھیلنے چلا گیا۔ اس کے دل کو تسلّی تھی کہ آج شام جب وہ کام سے لوٹے گا تو بہن کو روتا ہوا نہیں پائے گا۔

بادشاہ اس دِن بھی جنگل میں آیا ہُوا تھا۔ جُوں ہی اُس نے اپنے شکار کا نشانہ لیا، درختوں کے پیچھے اُسے سنہری بالوں والے نوجوان کی جھلک دکھائی دی۔ اُس کا ہاتھ ہل گیا۔ تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ بادشاہ کا دل اُداس ہو گیا۔ وہ اِتنا نڈھال تھا کہ ٹھیک طرح چل بھی نہ سکتا تھا۔ درباری اُسے سہارا دے کر محل میں لے گئے۔

مکّار کنیز محل کی بالکونی سے بادشاہ کو جنگل سے واپس آتے دیکھ رہی تھی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کی یہ حالت سنہری بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر ہوئی ہے۔ نفرت اور غصّے سے اُس کا دم گھُٹنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ بادشاہ نوجوان سے محبّت کرنے لگا ہے۔

موقع پاتے ہی کنیز نے جنگل کی راہ لی اور لڑکی کی کُٹیا میں جا کھڑی ہوئی۔ لڑکی اُس وقت آئینہ دیکھ دیکھ کر خُوش ہو رہی تھی۔ کنیر کو دیکھ کر چانک اُٹھی اور بولی:

"میں آپ کی احسان مند ہوں۔ اب میں یہاں بیٹھی اس آئینے میں ساری دنیا دیکھ سکتی ہوں۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں۔"

کنیز نے کہا۔ "بیٹی، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ کیا ہی اچھّا ہو جو تُمھیں جادُوگر سہیلی مل جائے۔ اُس کے مُقابلے میں جادُو کی ٹہنی اور جادُو کا آئینہ کیا چیز ہیں۔ تُم خُود ہی سوچو، جادُوگر سیلی پریوں کی ملکہ کے سِوا اور کون ہو سکتی ہے۔"

"پریوں کی ملکہ اس غریب کی کٹیا میں کیسے آ سکتی ہے۔۔۔ بالکل نامُمکن۔"

"تُم اپنے بھیّا سے کہو۔ وہ اُسے بھی ضُرور لے آئے گا۔" مکّار عورت نے اس طرح کہا، جیسے یہ بُہت ہی آسان کام ہو۔ "بس تُم اسی طرح رونا دھونا اور کہنا کہ پریوں کی ملکہ کو لا دو تو مُجھے چین آئے گا، ورنہ نہیں۔"

لڑکی کو خوب سِکھا پڑھا کر کنیز محل میں واپس آگئی۔ اُسے یقین تھا کہ نوجوان اس مُہم سے زندہ نہیں لوٹے گا۔ وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ لڑکی بُہت بے وقوف ہے۔ پریوں کی ملکہ کو سہیلی بنانے کا شوق اُسے پاگل کر دے گا۔

بھائی کو بہن کی نئی فرمائش کا علم ہوا تو وہ بُہت مایوس ہوا۔ اس راستے میں پیش آنے والی مُشکلوں کا اُسے پورا احساس تھا۔ اُس نے بہن کو سمجھایا:

"پیاری بہن، تم جانتی ہو میں تُمہارے لیے سب کُچھ کر سکتا ہوں، مگر پریوں کا مُلک یہاں سے بُہت دُور ہے اور راستہ نہایت دشوار۔ یوں سمجھ لو کہ میں اس راہ پر گیا تو واپس نہیں آؤں گا۔"

لیکن احمق لڑکی تو کنیز کی باتوں میں آگئی تھی۔ بھائی کی منّت سماجت کا اس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ بھائی نے بار بار کہا کہ "بہن، سوچ لو، اس کا کیا نتیجہ ہو گا۔ مگر اس کے

آنسو بہنے بند نہ ہوئے اور ہچکیوں میں کمی نہ ہوئی۔ اس نے تو بس ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ مجھے ملکہ پری چاہیے۔

بھائی بے چارہ اگلی صُبح اس مُہم پر بھی روانہ ہو گیا۔ اس نے سوچا، جو ہو سو ہو۔ مرنا تو ایک بار ہے۔۔۔۔ وہ سیدھا جنّات کی ملکہ کے پاس پہُنچا اور ایک بار پھر اُس سے مدد کی درخواست کی۔

"دوبارہ سوچ لو، میرے بیٹے۔" جنّات کی ملکہ نے کہا۔ "اب تک جس انسان نے بھی اس مُہم پر جانے کی جرأت کی، وہ تباہ و برباد ہو گیا۔"

"ماں جی، میں آپ کی مِنّت کرتا ہوں۔ آپ مُجھے صرف راستہ بتا دیں۔" لڑکے نے کہا۔

اُس کا پکّا ارادہ دیکھ کر جنّات کی ملکہ نے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا:

"پہلے تُم اُس راستے پر جانا جہاں سے جادُو کی ٹہنی لائے تھے۔ پھر وہ راستہ اختیار کرو جس راستے سے تُم آئینہ لینے گئے تھے۔ اس کے بعد تُمہارے سامنے ایک

صحرا آئے گا۔ اس میں ایک راستہ دائیں ہاتھ جاتا ہے اور دوسرا بائیں ہاتھ۔ ان دونوں راستوں کے درمیان بُہت اندھیرا ہو گا۔ تُم اس اندھیرے میں کُود پڑتا اور اپنا سفر جاری رکھنا۔

"کچھ دُور چلنے کے بعد اندھیرا مدّھم روشنی میں بدلنے لگے گا اور تُم اپنے آپ کو شاہ بلوط کے جنگل میں پاؤ گے۔ شاہ بلُوط کے درختوں سے بھرا ہُوا یہ جنگل اُن نوجوانوں کا قبرستان ہے جو پریوں کی ملکہ کو حاصل کرنے گئے اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تُم اس جنگل میں سے، دائیں بائیں دیکھے بغیر، تیزی سے گزرنا۔ جُوں ہی یہ جنگل ختم ہو گا، محل تُمھارے سامنے آ جائے گا۔ یہاں پُہنچ کر پریوں کی ملکہ کو آواز دینا۔"

جنّات کی ملکہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی اور پھر آہ بھر کر بولی۔ "اس کے بعد کیا ہو گا میرے بچّے، یہ میں نہیں جانتی۔"

دوسرے روز سُورج نے مشرق سے ابھی جھانکا نہ تھا کہ سنہری بالوں والا نوجوان نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ جنّات کی ملکہ کی ہدایات کے مُطابق چلتا گیا، اور دِنوں

کا سفر گھنٹوں میں طے کرتا صحرا کے کنارے پُہنچا تو اُس نے نہ تو دائیں ہاتھ والا راستہ اِختیار کیا، نہ بائیں ہاتھ والا۔ بس ان کے درمیان اندھیرے میں کُود گیا اور بہادری سے سفر جاری رکھا۔

چلتے چلتے اندھیرا کم ہونے لگا اور وہ جلد ہی شاہ بلُوط کے جنگل میں پہنچ گیا۔ یہاں اُس نے دائیں دیکھا نہ بائیں، بس ناک کی سِیدھ میں چلتا رہا۔ اُس نے جو کچھ دیکھا، وہ رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس جنگل میں پریوں کی ملکہ کو ڈھونڈنے والے نوجوانوں کی ہڈّیاں نہیں تھیں بلکہ اُن کے پتھّر کے بُت کھڑے تھے۔ یہ نوجوان پریوں کی ملکہ کو حاصِل کرنے آئے تھے اور جادُو کے زور سے پتھّر کے بُت بن گئے تھے۔ ان درختوں پر کوئی پرندہ نہیں چہچہاتا تھا۔ ہر طرف موت کی خاموئی چھائی ہوئی تھی۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر بھی نوجوان چلتا رہا۔ اگرچہ خوف کے مارے اس کا دِل ڈوب رہا تھا۔

چلتے چلتے اندھیرا بالکل چھَٹ گیا۔ سنہری بالوں والا نوجوان جنگل کے دوسرے کنارے تک پہنچا تو ہر طرف روشنی پھیل چکی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے سُورج کی

کرنیں اس کی آنکھوں کو چُندھیا دیں گی۔ آنکھوں پر ہاتھوں کی اوٹ کر کے اُس نے دُور تک دیکھا۔ کچھ فاصلے پر پری محل تھا۔ یہ محل کھُلی دھوپ میں اس قدر دمک رہا تھا کہ اِنسان کا ذہن سوچ بھی نہیں سکتا۔

نوجوان یہ نظارہ دیکھ کر بہُت خُوش ہوا۔ اُس کی منزل اُس کے سامنے تھی۔ وہ مُنہ پر دونوں ہاتھوں سے بھونپو سا بنا کر آواز دینے لگا۔ اچانک اُسے اپنی ٹانگیں ایسی لگیں جیسے سُن ہو گئی ہوں۔ سنہری بالوں والا نوجوان بھی ہولے ہولے پتھّر بن رہا تھا۔ اُس نے خُوف زدہ ہو کر ملکہ کو آواز دی۔ ابھی آواز کی گونج خاموشی میں گُم نہیں ہوئی تھی کہ اُس کے ہاتھ پتھرا گئے۔ پھر وہ کاندھوں تک پتھّر کا ہو گیا۔ اب وہ دُوسرے نوجوانوں کی طرح پتھّر بنا کھڑا تھا۔ پریوں کی ملکہ نے اُس کی آواز سُن لی تھی۔ وہ ہاتھ میں سونے کا پیالہ لے کر باغ میں آئی۔ باغ کے درمیان میں ایک حوض تھا۔ اس نے حوض سے پیالے میں پانی بھرا اور سنہری بالوں والے نوجوان پر چھِڑکا۔ پانی کے چھینٹے پڑتے ہی نوجوان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ چہرے پر رونق آ گئی۔ اس کے سنہری بال پہلے کی طرح چمکنے لگے۔

ملکہ نے کہا۔ ”تم نے تیسری بار جرأت کی یہاں آنے کی۔ اب تم بچ کر نہ جا سکو گے۔ میں تُمہیں پتھّر کے بُت میں بدل دوں گی۔ تم ہمیشہ یہیں گڑے رہو گے۔“

نوجوان نے خوف زدہ ہوئے بغیر کہا۔ ”ملکۂ عالیہ، کیا مُجھے معافی نہیں مل سکتی؟“

”معافی؟“ ملکہ نے طنز سے کہا۔ ”تم ایک بار آئے اور میری جادُو کی ٹہنی لے گئے۔ دوسری بار آئے تو میرا جادُو کا آئینہ لے گئے۔ اب تیسری بار آئے ہو اور معافی مانگتے ہو۔ کیا مذاق بنا رکھا ہے تم نے؟“

نوجوان نے کہا۔ ”میں معافی مانگنے کے لئے حاضر نہیں ہُوا ہُوں۔ میں تو آپ کو لینے آیا ہوں۔“ ملکہ بولی۔ ”مُجھے لینے آئے ہو؟“ اس کے دِل پر نوجوان کی بے خوفی اور جرأت نے بُہت اثر کیا تھا۔ جب نوجوان نے اُسے اپنی بہن کی خواہش بتائی تو وہ نرمی سے بولی:

”آؤ، میں تُمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

نوجوان کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن اچانک اُسے ان بدنصیب نوجوانوں کا خیال

آیا اور ملکہ کی تلاش میں یہاں تک آئے اور بُت بن گئے۔ اُس نے ملکہ سے درخواست کی:

”اے ملکۂ عالی مقام، کتنا اچھا ہو جو ان بدنصیبوں کو بھی ان کی زندگیاں مل جائیں۔“

”یہ بھی ہو جائے گا۔“ ملکہ نے اتنا کہا اور حُوض سے سونے کا پیالہ دوبارہ بھر لائی۔ اُس نے نوجوانوں کے بُتوں پر باری باری پانی چھڑکا تو سارے قیدی نوجوان دوبارہ زندہ ہو گئے۔

نوجوان ملکہ کو لے کر سنہری بالوں والی بہن کے پاس آ گیا۔ بہن اور بھائی دوبارہ ملے تو اُن کی خُوشی کی حد نہ تھی۔ اور جب لڑکی کو پتا چلا کہ اُس کا بھائی سچ مُچ پریوں کی ملکہ کو لے آیا ہے تو اُسے یُوں لگا جیسے وہ ہوا میں اُڑ رہی ہو۔

تینوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ سنہری بالوں والے بہن بھائیوں نے اپنی کہانی پریوں کی ملکہ کو کہہ سُنائی۔ ایک دِن نوجوان شکار کھیلنے جانے لگا تو ملکہ نے اس سے کہا:

”آج تم شکار پر جاؤ گے تو تُمہاری ملاقات بادشاہ سے ہو گی۔“

”میری ملاقات اُن سے اکثر ہوتی ہے۔“نوجوان نے بتایا۔

”لیکن اس بار بادشاہ تُمہیں محل میں آنے کی دعوت دے گا۔ یاد رکھو! یہ دعوت ہر گز قبول نہ کرنا۔“ ملکہ نے سمجھایا۔

نوجوان جنگل میں شکار کی تلاش کر رہا تھا تو بادشاہ بھی آ گیا۔ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔

بادشاہ کے دل میں نوجوان کو دیکھ کر ہمیشہ تڑپ پیدا ہو جاتی تھی۔ آج اس کے اظہار کا موقع ملا تو اُس نے کہا:

”مجھے کتنی خوشی ہو اگر آج آپ میرے محل میں چلیں۔ محل میں بیٹھ کر کھائیں پئیں گے اور باتیں کریں گے۔“نوجوان کے دل میں بادشاہ کی بڑی عزّت تھی۔ لیکن وہ مضبُوطی سے اپنے ارادے پر قائم رہا اور اُس کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر گھر آ کر سا واقعہ ملکہ کو سُنایا۔

اگلے دن ملکہ نے دونوں بہن بھائیوں کو بُلایا اور تالی بجا کر اپنے وزیر کو آواز دی۔ ایک دم تیز روشنی ہوئی اور ایک لمحے کے اندر اندر اُن کے سامنے ایک بُوڑھا پری زاد کھڑا تھا۔ یہ پریوں کی ملکہ کا وزیر تھا۔

"میرے ابّا حنور کا گھوڑا حاضر کرو۔" ملکہ نے حکم دیا۔

اسی وقت وزیر غائب ہو گیا اور چند لمحوں بعد سفید رنگ کا ایک شان دار گھوڑا حاضر ہو گیا۔

ملکہ نے نوجوان کو گھوڑے پر سوار ہونے کا اِشارہ کیا۔ جوں ہی اُس نے رُکاب میں پاؤں رکھا، نوکروں چاکروں کی ایک فوج حاضر ہو گئی۔ ان سب کا ساز و سامان کسی بادشاہ کے ساتھیوں کی آن بان سے کم نہ تھا۔ ملکہ نے نوجوان کو ہدایت کی:

"اب شاہی محل جاؤ اور بادشاہ سے ملو۔ لیکن اپنے گھوڑے کی ہنہناہٹ پر دھیان رکھنا۔ جہاں بھی ہو، جس حال میں بھی ہو، گھوڑے کے ہنہناتے ہی واپس آ جانا۔"

نوجوان ملکہ سے وعدہ کر کے نوکریوں کے ہمراہ محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُس کا جلُوس دیکھنے سے تعلّق رکھتا تھا۔ سنہری بالوں والا حسین نوجوان سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں نوکروں کی فوج تھی۔ لوگ سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے اس عظیمُ الشّان جلُوس کو دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہادر شہزادہ کوئی مُہم سر کر کے اپنے گھر واپس آ رہا ہو۔

بادشاہ نے نوجوان کا شان دار اِستقبال کیا۔ رات کو بُہت بڑی دعوت کا اِنتظام کیا گیا، جس میں طرح طرح کی مٹھائیاں، قسم قسم کے پھل اور بے شمار لذیذ کھانے تھے۔ سُرخ بالوں والا نوجوان تمام وقت چوکنّا رہا۔ جب سب لوگ دعوت کے مزے لے رہے تھے تو اُس کو گھوڑے کی ہنہناہٹ سُنائی دی۔ نوجوان ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اُس نے بادشاہ کو اگلے روز اپنے غریب خانے پر آنے کی دعوت دی اور جانے کی اجازت چاہی۔ بادشاہ نے بُہت اِصرار کیا کہ بیٹا، ابھی نہ جاؤ۔ ابھی میرا دل نہیں بھرا۔ مگر سنہری بالوں والے نوجوان نے ایک نہ سُنی۔ جلدی

جلدی سفید گھوڑے پر سوار ہوا اور اُسے تیز دوڑاتا جنگل میں جا پہنچا۔

جب سنہری بالوں والا نوجوان محل میں تھا، پریوں کی ملکہ گھر میں بیٹھی منتر پڑھتی رہی تھی۔ اُس نے جادُو کے زور سے سنہری بالوں والے بچّوں کی ماں کو قبر سے نکال کر دوبارہ جوان اور حسین بنا دیا۔ لیکن اس کے بارے میں کِسی کو بتایا نہیں۔

دُوسرے دِن ملکہ نے پھر تالی بجا کر اپنے وزیر کو طلب کیا اور اُس سے کہا۔ "اس کُٹیا کو محل میں بدل دو۔"

پلک جھپکتے میں گھاس پھُونس کی کُٹیا غائب ہو گئی۔ اب اُس کی جگہ ایک عالی شان محل کھڑا سُورج کی روشنی میں جگ مگ کر رہا تھا۔ نوکروں کی فوج کی فوج، زرق برق لباس پہنے، بادشاہ کے اِستقبال کے لیے تیّار کھڑی تھی۔ جب بادشاہ آیا اور یہ دُھوم دھام دیکھی تو حیران رہ گیا۔ سنہری بالوں والے نوجوان نے اُسے سب سے زیادہ سجے ہوئے کمرے میں بٹھایا۔

پہلے شربت پیش کیے گئے۔ جب بادشاہ شربت پی رہا تھا تو گویّے، جادُو کے سازوں

پر نغمے چھیڑ کر، اُس کا دِل لُبھا رہے تھے۔

غرض بادشاہ کی خوب خاطر کی گئی۔ کھانے پینے، ناچ گانے کا سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا۔ رات کی سیاہی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی تو ایک ملازم نے آکر عرض کی:

"عالی جاہ کی مرضی ہو تو زنانے تک چلیں۔"

بادشاہ زنان خانے میں پُہنچا تو اُس کے ہوش جاتے رہے۔ وہاں نہ صرف سنہری بالوں والا نوجوان اور اُس کی سنہری بالوں والی بہن تھی بلکہ بادشاہ کی پیاری ملکہ بھی موجود تھی، جسے برسوں پہلے اُس نے محل سے دھکّے دے کر نِکال دیا تھا۔ وہ آج بھی اُتنی ہی جوان اور حسین تھی۔

ملکہ نے بادشاہ کو دیکھا تو جھک کر آداب بجالائی اور بادشاہ کی عبا کا دامن پکڑ کر چُوما۔ بادشاہ دیر تک ملکہ کا ہاتھ تھامے اُسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے محبّت سے دونوں بچّوں کو گلے لگالیا۔

پریوں کی ملکہ ایک طرف کھڑی یہ خُوشی اور غم کا منظر دیکھتی رہی۔ جب بچّے اور

والدین خُوب جی بھر کے ایک دوسرے سے مِل چُکے تو پریوں کی ملکہ آگے بڑھی اور سارا قصّہ بادشاہ کو کہہ سنایا۔

بادشاہ نے وہیں کھڑے کھڑے حکم دیا کہ محل کی مکّار کنیز کو فوراً اندھے کنویں میں ڈال دیا جائے۔ اور وہ کُٹنی، جس نے مکّار کنیز کو پٹّی پڑھائی تھی، اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا جائے۔

پھر بادشاہ نے خاندان کے اکٹھّے ہونے کی خُوشی میں بُہت بڑا جشن منانے کا حکم دیا اور سنہری بالوں والے شہزادے کی شادی ملکہ پری سے کر دی۔ پُورے ملک میں تین دن اور تین راتیں شادی خانہ آبادی اور بچھڑے ہوؤں کے ملنے کی خوشی میں جشن منایا جاتا رہا۔